

زندگی میرے لئے گنبد بے درٹھہری



ہما کوکب بخاری

زندگی میرے لئے گنبد بے درمٹری.....

وہ عورت نہیں ہے کیونکہ عورت تو پاکیزگی اور تقدس کا دوسرا نام ہے، ہاں وہ عورت نہیں ہے۔ وہ تو صرف طوائف ہے، طوائف۔ کتنا زہریلا لفظ ہے طوائف۔ وجود کو اندر تک کاٹ دینے والا، ریزہ ریزہ کر دینے والا، عورت خواہ مخواہ ہی اعتبار کی حد پھیلا تک کر بے اعتباری کی حد میں جا داخل ہوتی ہے، پھر وہ چاہے کچھ کر لے، سب سے بے نیاز ہو کر محبت اور وفا کی راہوں پر جتنا آگے بڑھ جائے، یہ ایک لیبل اسے واپس اسی کوٹھے پر دھکیل دیتا ہے جہاں سے پیچھا چھڑا کر وہ آتی ہے۔“

ایک نوخیز طوائف کی دلگداز کہانی، وہ عزت کی زندگی جینا چاہتی تھی۔

کدھر جا رہی ہے، کہاں جا رہی ہے؟
حیات اندھے ماضی کی اٹکی پکڑ کر
کدھر لے چلی ہے، کہاں لے چلی ہے؟
غمِ دل کی زنجیر مجھ کو جکڑ کر!

کسی انجمن میں بھی جانا عبث ہے
کوئی سی بھی محفل سجانا عبث ہے

یہ دھلتی ہوئی شب
یہ خوابوں میں کھویا ہوا آخری پہر کس کا ہوا ہے؟
یہ بے رحم گلیاں، یہ بے مہر سڑکیں
یہ سویا ہوا شہر، کس کا ہوا ہے؟

صدا دے کے اس کو جگانا عبث ہے
کسی گھر، کسی در پہ جانا عبث ہے

یہ گہری اداسی ہے مدت سے پیاسی
مرے ذہن و دل کی، میرے جسم و جاں کی

اسے آنسوؤں سے بجھانا عبث ہے
ستارے زمیں پر اُلٹانا عبث ہے

وہ ہولے سے ہنس پڑی۔ ”اماں یہاں کی زندگی اور روزی روٹی اس رات سے تو وابستہ ہے، جتنی یہ پیچھے لگی اتنا ہی جا دو بڑھے گا۔ یہاں تو سونے کے لیے دن ہوتا ہے۔“

”کل چو بدری سلطان بخش نے آئے کو کہا ہے، انہیں کیا جواب دوں۔“ زمر دبائی

نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔

”جیسا آپ چاہیں گی۔ ویسا ہی ہوگا۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور کبل منہ پر رکھ لیا۔

☆=====☆

فیروز کی رنگ کے پیورسلک کے سوٹ میں ملیوں، سر پر کا مہار دوپٹے کا آنچل ڈالے

آن تمکین بے حد بیماری لگ رہی تھی اور خوش بھی۔ یہ خوشی اس کی برہنہ بات، ہر انداز سے

ہوید تھی۔ وہ اسے جتنا چھپانے کی کوشش کرتی، جتنا سختی، وہ اتنا ہی ظاہر ہوتی۔

”اللہ تعالیٰ تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔“ امی نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ ”چلو

اب، مہمان آچکے ہیں۔“

وہ رباب اور صوفیہ کے ساتھ نگاہیں نیچی کیے ڈرائینگ روم میں پہنچی۔ صوفیہ پر بیٹھے

بیٹھے اس نے کن انکلیوں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ زمین اس کے مقابل والے صوفیہ پر بیٹھا

دلچسپی سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا، تمکین نے گہرا کرنگا جہاں چرائیں۔ اس پر گہرا ہنس

طاری ہونے لگی تھی، اتنے بہت سے لوگ اس کی طرف متوجہ تھے، پہلے بھی وہ اتنے بہت

سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی تھی، لیکن اس طرح دلہن بنے ہوئے نہیں، اس لیے کنفیوز

ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد تمکین کی تقریب شروع ہوئی۔ زمین کی امی نے انگوٹھی کی ڈیاں اس کی

جانب بڑھائی، انگوٹھی نکال کر وہ تمکین کی طرف بڑھا، کیر سے تیار ہو گئے، تمکین کو صرف

زمین کے قدم نظر آ رہے تھے، جو لمحہ لمحہ تقریب تر ہو رہے تھے پھر وہ قدم رک گئے، زمین

نے تمکین کا ہاتھ تھاما۔

”تمکین اتنی آسانی سے انگوٹھی نہیں پہنتی۔“ رباب پہنچی۔

کہیں کچھ ملے، کوئی دیوار نوٹے

کوئی روشنی غم کے اس پار پھوٹے

تو شاید یہ دل قید ظلمت سے چھوٹے

وگرنہ یہ سیرِ شانہ عبث ہے!

بہر گام یوں ڈگر گنا عبث ہے

نگار نے آنکھیں موند لیں۔ ”دل وحشی کا ماتم کب تک؟ ساعت گریز پاکی آرزو

کب تک؟ لا حاصل کی تلاش کب تک؟ وہ عورت نہیں ہے کیونکہ عورت تو پاکیزگی اور

نقدس کا دوسرا نام ہے، ہاں وہ عورت نہیں ہے۔ وہ تو صرف طوائف ہے، طوائف۔ کتنا

زہریلا لفظ ہے طوائف۔ وجود کو اندر تک کاٹ دینے والا، ریزہ ریزہ کر دینے والا، عورت

خواہ خواہ ہی اعتبار کی حد پھیلاؤ کرے اعتبار کی حد میں جا داخل ہوتی ہے، پھر وہ چاہے

کچھ کر لے، سب سے بے نیاز ہو کر محبت اور وفا کی راہوں پر جتنا آگے بڑھ جائے، یہ

ایک لیبیل اسے واپس اس کو ٹھٹھے پر فیکٹل دیتا ہے جہاں سے پیچھا چھڑا کر وہ آتی ہے۔“

وہ اٹھ کر کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانک لگی، رات اپنے عروج پر تھی، گلی کے ہر

کوٹھے پر روشنی تھی، طبلے اور پازیبوں کی مدھر آوازیں خنک رات کے اندھیرے میں کہیں

تھلیل ہو رہی تھیں، موسیقی کی خوشبو فضا میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کسی نے دروازے پر

ہلکی سی دستک دی، نگار نے مڑ کر بند دروازے کو دیکھا، جو آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ زمر دبائی

نے اندر آ کر ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا، جیسے کمرے کی بوجھل فضا سے نگار کی سوچوں کا

اندازہ لگانا چاہ رہی ہوں۔

”کھڑکی بند کرو۔ اتنی ٹھنڈی ہوا میں کاہے کو کھڑکی ہو۔“ پھر انہوں نے خود ہی آگے

بڑھ کر کھڑکی بند کر دی۔ ”رات بہت بیت گئی ہے، چلو جلدی سے سو جاؤ۔“ انہوں نے

زبردستی نگار کو مسہری پر دھکیلا۔

”وہ ہماری اور ہماری نند کی آنکھیں ہوں گی۔“ وہ ہنسنے پر دراز ہوتے ہوئے بولی۔ ”اور ہماری نند کے منگیتر جاپان گئے ہوئے ہیں۔ بس کچھ ایک مہینے کی بات ہے، جیسے ہی وہ واپس آئے، ساتھ ہی شادی ہو جائے گی۔“

”چلو اچھا ہے، اتنا وقت ملنا چاہیے تیاری کے لیے۔“ صوفیہ نے کہا۔

”تیاری کیا کرتی ہے، سب کچھ بنا پڑا ہے، امی تو ایک گھنٹے کے نوٹس پر میری شادی کر سکتی ہیں۔“

”تو پھر چھ مہینے تک آرام کرو خوب کھاؤ پیو، بیش کرو، اور روزانہ زین بھائی سے فون پر باتیں کیا کرو۔“ رباب نے مشورہ دیا۔

”ہائے کس دیکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔“ تمکین نے مصنوعی آہ بھری۔ ”میری تو کوئی چھوٹی بہن ہی نہیں ہے جو میرے کام آئے، اسی طرح جیسے میں سہجہ آپا اور اما کے کام آیا کرتی تھی۔“

”یار، ہم کس لیے ہیں، حکم کرو ابھی حاضر کر دیتے ہیں تمہارے صاحب بہادر کو تمہارے حضور۔“ صوفیہ نے ایسے کہا جیسے جج جج زین کا ہاتھ پکڑ کر اسے تمکین کے پاس لانے کا ارادہ رکھتی ہو۔

”نہیں، اللہ دین کے چراغ کے جن۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ تمکین نے جلدی سے کہا۔

”ویسے ایک بات ہے یار!“ صوفیہ بولی۔ ”زین بھائی ہیں بڑی زبردست چیز۔“ تمکین ہنس پڑی۔

اس کی زین سے پہلی ملاقات بہت سرسری تھی۔ کتنی دیر سے اس نے منو کو پیاز لانے مارکیٹ بھیجا ہوا تھا لیکن مونرس سائیکل منو کے ہاتھ لگے اور وہ جلدی واپس آ جائے، ایسا سوچتا ہی حماقت تھی، ابھی وہ پیاز کے آنے کا انتظار ہی کر رہی تھی کہ گیٹ کی کھنسی بجی۔ وہ اپنی چھوٹی سی پونی جھلاتی گیٹ کی طرف بھاگی۔

”ہاں، کچھ تنگ تو کرو۔“ صوفیہ نے بھی اسے شہد دی۔ ”جب تک تنگ نہیں کرو گی، نہیں تمہاری قد و قیمت کا اندازہ بالکل نہیں ہو گا۔“

تمکین نے ان کی بات سن کر ایک دم مضطرب ہو کر لی۔ سب ہی ہنس پڑے۔ زین نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ تھام کر انگوٹھی پہنانے کی کوشش کی، لیکن تمکین نے دوبارہ مضطرب ہو کر لی رباب اور صوفیہ کا قبضہ بلند ہوا۔ تمکین نے ہشکل تمام ہونٹ کاٹ کر اپنی ہنسی روکی۔

”مجھے لگتا ہے، تھوڑی سی زبردستی کرنی پڑے گی۔“ زین نے خوشدلی سے کہا، اور مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر انگلی میں انگوٹھی پہنادی۔

”اُف!“ تمکین کے منہ سے سسکی سن گئی۔

اس مرتبہ پھر اس نے پرانی حرکت دہرانے کی کوشش کی تھی، لیکن زین نے اسے مضطرب نہیں کرنے دی، اور اسی انگشت میں تمکین کے لیے ناخن نے زین کے ہاتھ کی پشت پر اچھا خاصا زخم کر ڈالا۔

”کوئی بات نہیں۔“ زین نے آہستگی سے کہا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اپنے کمرے میں واپس جاتے ہوئے زین کے ہاتھ کا کس اپنے ہاتھ پر محسوس کر رہی تھی۔

”بڑے دلیر ہیں تمہارے ہونے والے وہ۔“ رباب نے اسے پھیرا۔ ”اتنے مزے سے زبردستی انگوٹھی پہنادی۔“

”حالانکہ سماج کی تمام ظالم دیواریں بھی وہاں موجود تھیں۔“ صوفیہ نے ٹکڑا لگایا۔ ”مجھے تو مرزا اور راجہ پر تقویٰ کے جانشین لگتے ہیں تمہارے یہ ہونے والے صاحب بہادر۔“

”آہ۔“ تمکین نے دوپٹہ اتار کر تہہ کرتے ہوئے کہا۔ ”امی نے سن لیا تو ایک مرتبہ پھر شجرہ سحر کر بیٹھ جائیں گی ان کا۔ کہ ہم تو بیٹی نجیب الطرفین خاندان میں بنائے چلے تھے، یہ مرزا اور راجہ پر تقویٰ کے خاندان کے ساتھ جوڑ کہاں سے آ گیا۔“

”اب شادی کے کیا ارادے ہیں؟“

”پڑا کرتا رہے۔“ پھر مڑتے مڑتے امی کو خیال آیا۔ ”اور کچھ پکڑے بھی بنا دو۔“
 ”امی! لگتا ہے، آپ کا مہمان بہت پیٹا ہے۔“

”کمال کرتی پھرتی ہوئی تھی، ظفر کا دوست ہے اور اس کی سسرال آیا ہے تو کیا سو کھے مند ہی چلتا کروں اسے۔“ امی نے اس کو گھورا۔ ”کیا سوچے گا کہ اچھی سسرال ہے ظفر کی۔“
 پھر امی اس کے قریب سرک آئیں۔ ”ظفر کی شادی اس کی بہن سے ہو رہی ہے۔“

اظہر تمکین کی سمیٹہ آیا کا دیور اور ظفر بھائی کا چھوٹا بھائی تھا۔

”کس کی بہن سے؟“ اس نے تین گھولتے ہوئے پوچھا۔

”اسی زین کی بہن سے۔“

”اچھا، تمکین نے سر ہلایا۔“

”تم چیزیں تیار کر کے مجھے بتا دینا، میں لے جاؤں گی۔“ یہ کہہ کر امی ڈرائنگ روم میں چلی گئیں اور وہ جلدی جلدی سے پکڑے تلنے لگی۔

اور پھر اگلے دن سے کراچی اور لاہور کے درمیان باٹ لائن چلنے لگی۔ اچانک ہی س۔ اور ظفر بھائی کو امی اور ابو سے ضروری کام یاد آنے لگے تھے، شروع میں تو تمکین نے کچھ ایسی پروا نہ کی، لیکن پھر اس کے بھی کام کھڑے ہو گئے۔

”دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔“ اس نے مونگ کی دال صاف کرتے ہوئے منہ کے سامنے اعلان کیا۔

”تو نکال باہر کریں، دال بھی آپ کے سامنے ہے اور کالا بھی۔“ ابو نے ایک کسے اوپر سے جھانکا۔

”مجھے لگتا ہے، کوئی خاص ہی کچھڑی پک رہی ہے۔“ وہ پھر بولی۔

”ظاہر ہے، مابدولت کے پیٹ میں درد ہے، اصولاً خاص کچھڑی ہی پکئی جائیے۔“

”تمہارا تو دماغ بالکل ہی الٹ گیا ہے۔“ تمکین نے اسے گھورا۔

”میرے لیے یہ خاصا تکلیف دہ انکشاف ہے لیکن آپ بتانا پسند کریں گی کہ آپ

”منو کے بیٹے آج تم میرے ہاتھوں قتل ہو جاؤ گے۔ اتنی دیر پیاز لانے میں کی، یا وہاں مسئلہ کثیر حل کرنے میں مصروف.....“ لیکن اس کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔

گیٹ کے سامنے ایک سفید ٹیوٹا کرینڈا کھڑی ہوئی تھی، اور لیپ پوسٹ کی زد روشنی تلے ایک اجنبی ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا تھا، ایک لمحے کے لیے وہ جھجک کر رک گئی۔

”جی! اس نے گیٹ کھولے بغیر پوچھا۔

”فقوی صاحب سے ملنا تھا۔“

”آپ؟“ اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”زین العابدین۔“ وہ بولا۔ ”مجھے ظفر صاحب نے کچھ چیزیں دی تھیں پہنچانے کے لیے۔“

”ظفر بھائی نے؟ ایک منٹ۔“ وہ اسے انتظار کرنے کا کہہ کر اندر بھاگی۔

”ابو جی! کوئی بندہ آیا ہے آپ سے ملنے، کہہ رہا ہے، کہ ظفر بھائی نے کچھ چیزیں بھجوائی ہیں۔“

”اوہ ہاں! یاد آیا۔“ ابو جی کھڑے ہوئے۔ ”ظفر نے مجھے فون کیا تھا آج صبح۔ کہہ رہا تھا کہ اس کا دوست زین العابدین کچھ چیزیں لے کر آئے گا۔“

پیاز پر تمکین نے اگلے ایک گھنٹہ کے لیے پھر فاتحہ پڑھی اور نووارد کے لیے چائے تیار کرنے لگی۔

”وہ کباب پڑے ہیں فریزر میں، تل لیانا۔“ امی نے کچن میں جھانکا۔ ”اور وہ دو تم نے کیک بنایا تھا وہ بھی رکھ دینا۔“

”وہ تو میں نے منو کے لیے بنایا تھا۔“

”اس نے کون سا سارا ٹھونس جاتا ہے۔ ایک آدھ جیس کوئی دوسرا لے لے گا تو منو

کے پیٹ میں درد نہیں ہو جائے گا۔“

”شور کرے گا وہ۔“ تمکین نے نارنگ دی۔

”لیس، یہ تو میرے ہائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“ منو نے کافی کے آخری چند گھونٹ جلدی جلدی حلق میں اندر لے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں امی ابو کی کچھڑی کا پتا کرتا ہوں اور آپ جلدی سے میرے لیے کچھڑی تیار کریں۔ قسم سے بڑا درد ہے پیٹ میں۔“ اور پھر ایک گھنٹے میں منو تمام تر تفصیلات کے ساتھ اس کے سامنے کچن میں موجود تھا۔

”اب مان جائیں بجو میں کسی سراغ رساں سے کم نہیں ہوں۔“
 ”اتنی جلدی بتا لگا آئے۔“ تمکین نے کچھڑی میں جھج چلاتے ہوئے حیرت سے کہا۔
 ”بات صرف اتنی ہے کہ بندے کو اپنی آنکھیں، ناک، کان کھلے رکھنے چاہئیں۔ ذمہ اٹھا کر رکھنی چاہیے۔ ساری گھنٹیاں خود ہی سلجھ جاتی ہیں۔“
 ”اب جلدی سے بتاؤ، تھیلے سے کون سی جلی برآمد ہوئی ہے۔“
 ”آپ سنیں گی تو دل میں لڈو کیا مٹھائی کی پوری دکان پھونسنے لگے گی۔ یعنی ہر طرف برفیاں ناپنے لگیں گی، رس لگے قص کریں گے، گلاب جاہن جہنا سنک کریں گے، سوہن طوے کے باغ آگئیں گے اور بجو آپ رس ملائی میں ڈبکی لگا دیں گی۔“
 ”ایسی کیا خاص بات ہوگی۔“ تمکین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
 ”ڈرامنہ تو مٹھا کرائیں۔ پھر بتاؤں گا۔“

”یہ لو، تمکین نے جھج بھر کر چینی اس کے منہ میں ڈالی۔

”بس سمجھ لیں آپ کے لیے خطرے کے سائزن بچ رہے ہیں۔“ منو کچر کچر چینی چباتا ہوا بولا۔

”یعنی تم نے میرے خطرے کے سائزن کی خوشی میں چینی پھا کی ہے؟“ تمکین نے اسے گھورا۔

”ارے نہیں۔ یہ تو میں نے اس خوشی میں پھا کی ہے کہ آپ کے جانے کے بعد اس گھر پر میرا راج ہو گا، مجھے کپڑے ڈرامنگ روم کے صوفوں پر پھینکنے سے روکنے والا کوئی

میرے متعلق اتنی غیر پارلیمانی زبان کیوں استعمال کر رہی ہیں۔“

”میں نہ اس دال کی بات کر رہی ہوں جس کے کالے میں ابھی نکال رہی ہوں اور نہ اس کچھڑی کی جواب تک عدم سے وجود میں تشریف نہیں لائی۔“

”تو پھر وضاحت کریں کہ آپ کا اشارہ کس کچھڑی کی طرف ہے؟“

”وہ جو پچھلے چند دنوں سے امی، ابو کے کمرے میں پک رہی ہے۔“

منو نے ایسے سر ہلایا جیسے بات کچھ کچھ سمجھ میں آرہی ہو۔ ”وضاحت کریں کہ اس کچھڑی میں کچھ کچھ کچھ چلا رہا ہے؟“

”بہت کوڑھ مغز ہوتی۔“

”بجو! آپ ایک مرتبہ پھر غیر پارلیمانی زبان کے استعمال کے جرم کی مرکتب ہوئی ہیں، یعنی میرے کمرے میں بیٹھ کر، میری رضائی میں گھس کر، آپ میرے ہی خلاف شراکیز پروپیگنڈا کر رہی ہیں۔“ منو چلا یا۔

”یہ شراکیز پروپیگنڈا یا ڈس انفارمیشن ہم نہیں ہے، یہ حقیقت ہے۔“ تمکین بولی۔
 ”بھئی صاف ظاہر ہے کہ کچھ چلا رہے ہیں ظفر بھائی اور سیدہ آپ! اب آیا عقل شریف میں کچھ۔“

”آگیا، بالکل آگیا۔“ منو نے سر ہلایا۔

”اب بولو، میں کوئی شراکیز پروپیگنڈا کر رہی ہوں یا تم ہو ہی کوڑھ مغز۔“ تمکین ہنسی۔

”میں آپ کی تمام تر اشتعال انگیز باتوں کو بلی رہا ہوں۔“ منو نے بلیک کافی کا گھونٹ بھرا۔ ”اب یہ بتائیں کہ میں اس سخت غیر پارلیمانی اور ناقابل اشاعت قسم کے لیبل کو خود پر سے ہٹانے کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“

”یہ بوئی ناں بات۔“ تمکین خوش ہو گئی۔ ”اگر تم یہ بتا لگا لو کہ امی ابو کے کمرے میں آخر کچھڑی کیا پک رہی ہے تو میں سمجھوں گی، کہ تم بالکل کوڑھ مغز نہیں ہو۔“

نہیں ہوگا۔ میں بغیر کسی ڈر خوف کے ڈانگ ٹیبل پر کتاہیں بکھیر سکوں گا۔ آبا کیسا حسین وقت ہوگا کوئی زبردستی صبح شام دودھ کا گلاس نہیں پلوئے گا، کھانے میں زبردستی سلا نہیں ٹھونٹا پڑے گا، کمرہ گنڈا کرنے پر کسی کی ڈانٹ نہیں سننا پڑے گی۔ ہر دھلائی میں میری چیز نہیں دھلا کرے گی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئی میری عقل کو چیلنج نہیں کیا کرے گا۔“

منو نے قہقہہ لگا دیا۔ ”کیوں بچو ہوں گے نا عیش اپن کے۔“

”میرے بھائی! تم اتنی آسانی سے عیش نہیں کر سکتے۔“ تمکین بولی۔ ”کیونکہ میرا فی الحال کہیں جانے کا ارادہ نہیں ابھی تو تمہیں ڈانٹیں بھی سننا پڑی گی، دودھ بھی پینا پڑے گا، سلا دھبی ٹھونٹنا ہوگا، تمہاری بھی ہر دھلائی میں ڈھلے گی، اور تمہاری عقل کو بھی چیلنج کیا جائے گا، کیا سمجھے؟“

”میری سمجھ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑنے کے بجائے اس وقت آپ کچھ سمجھ لیں تو ہم دونوں کے حق میں بہت اچھا ہوگا۔“

”اچھا۔ آپ بہت عالم فاضل ہو گئے ہیں، آپ سمجھا دیں مجھے۔“ تمکین نے منہ بتایا۔

”جناب آپ! وہ افسانوی زبان میں کیا کہتے ہیں، ہاں بیا دیں۔ تو محترمہ آپ بیا دیں سدھارنے والی ہیں۔“

”کیا؟“ تمکین نے آنکھیں پینا نکلیں۔

”جی ہاں، امی ابو کہہ رہے تھے کہ آپ کو گھر سے نکالنے کا وقت آگیا ہے۔“

”کچھ آگے بھی بکوائے نہیں، ظاہر ہے یونہی دھکا تو نہیں دیں گے مجھے۔“ وہ منو کی بے نیازی پر چڑھ گئی۔

”یہ واقعی ظاہر ہے کہ آپ کو یونہی دھکا دیا جائے گا کسی نہ کسی بے چارے کے پلے تو باغدیس گئے ہی، لیکن خیر مجھے آپ کے ہونے والے سے کچھ ایسی ہمدردی بھی نہیں ہے۔ کم از کم آپ کے میزائلوں کا رخ میری طرف سے تو ہٹ جائے گا۔“

”ٹھیک ہی کیے جاؤ گے، یا اصل بات بھی بتاؤ گے۔“

”بس ہو گئے گاں کھڑے۔“ منو ہنسا۔ ”سنیں کوئی مسٹر زین العابدین ہیں جو ظفر بھائی کے دوست ہیں اور غالباً کسی دن گھر بھی آئے تھے، آپ کو دیکھا تھا اور اپنی امی کی پسند کی بہت داد دی تھی۔“

”کیا بک رہے ہو۔ انہوں نے تو شاید غور سے دیکھا بھی نہیں تھا مجھے اور پھر مجھے بھی ان کی شکل یاد نہیں ہے۔“ تمکین بولی۔ ”راجس موصوف کی والدہ تو ان سے اب تک میرا کوئی تعارف نہیں ہے لہذا ان کی پسند اور محترم کی داد سب بے پڑ کی باتیں ہیں، جو تم اڑانے کی کوشش کر رہے ہو لیکن ان باتوں نے اڑنے سے صاف انکار کر دیا ہے، جدید سے ٹھیک ٹھیک بات بتاؤ۔“

”اتنی بھی کیا بے اعتباری کبھی تو پہلی مرتبہ ہی میری بات کا اعتبار کر لیا کریں۔“ منو بولا۔ ”بات یہ ہے کہ مسٹر زین العابدین کی ایک بہن ہیں، محترمہ ندا کے نام سے جانی پچانی جاتی ہیں ان کی شادی خانہ آبادی کے چکر میں زین صاحب کی والدہ سمیعہ آپا اور ظفر بھائی کے گھر مقیم تھیں، وہاں انہوں نے آپ کی تصویریں دیکھیں اور صحت آپ سے بارے میں سمیعہ آپا سے معلومات حاصل کرنا شروع کیں۔ سمیعہ آپا نے تمام تفصیلات ان کے گوش گزار کر دیں۔“ منو ایک لمحے کو مسکرایا۔ ”آگے ایک بڑی خالی جگہ ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے سے آپ کا ذکر کیا ہوگا اور ان کے بیٹے نے تہیہ کر لیا ہوگا کہ شادی ہوگی تو اس تصویر والی حسد سے درندہ نہیں۔ پھر آپ کے عشق میں بے تاب ہو کر انہوں نے یہاں کا رخ کیا ہوگا، اور گیت کھلنے کے ساتھ انہیں آپ دکھائی دی ہوں گی، اب اصولاً یہاں ایک گانا ہونا چاہیے تھا۔ شاید ہوا بھی ہو، لیکن آپ کہاں نا گئیں۔“

”بکواس کیے جاؤ گے۔“ تمکین نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ ”جب سے میٹرک میں پینچے ہو تمہیں بھی زکام ہو گیا ہے۔“

”زکام نہیں بھو! پیٹ میں درد ہو رہا ہے لیکن آج آپ کچھوی کیا کھلائیں گی۔ خوشی

”جی آپ کے ہاتھ کی لکیروں میں کہیں بہت واضح طور پر ”زید“ لکھا ہوا ہے؟“
منو ہنسا۔

”بہت خبیث ہوتم۔“ تمکین نے منو خلاف سے نکالا۔
”کیوں میری توہین کرتی ہیں۔ میں خبیث سے دس ہاتھ آگے یعنی خبیث ہوں۔“
”اٹھو فوراً اپنے کمرے میں جاؤ۔“ تمکین نے تکیہ اسے کھینچ مارا جسے منو نے بہت آرام سے کیچ کر لیا۔

”تیکے کی لڑائی کا ارادہ ہے؟“
”نہ بابا نہ۔ تم جاؤ اب۔“ تمکین نے اس کے سامنے کان پکڑے۔
”شباباش یہ ہوئی نابات۔ وہ ہماری ساتویں آٹھویں کی اردو کی کتاب میں تھا کہ۔“
مرتے کو مارنا ہے دردی سے
ہے بہت دور جو اندردی سے

منو بولا۔ ”اسی لیے آپ کو چھوڑے جا رہا ہوں۔“ وہ کمرے سے نکلے نکلے تکیہ اس کی جانب اچھال گیا۔

اگلے دن امی نے اسے اس کے کمرے میں پکڑ لیا۔
”تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ بولیں۔
تمکین کے کان کھڑے ہو گئے۔ اسے معلوم تھا کہ امی کی خاص بات کیا ہوگی۔ لیکن اس نے بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اسے کچھ خبر ہے۔

”جی امی!“ وہ سعادت مندی سے بولی۔
”دیکھو بیٹا! اس دنیا میں رہنے کے لیے زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ اصول بنائے ہیں۔ یہ اصول صدیوں سے رائج ہیں اور ہمیشہ رائج رہیں گے۔“ امی نے تمکین کے چہرے پر ردِ عمل تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے جلدی سے نگاہیں جھکا لیں۔ ”انہی اصولوں اور ضابطوں کی وجہ سے دنیا میں زندگی رواں دواں ہے۔ میں غلط تو

کہہ رہا ہوں؟“ وہ منو کے لیے سب سے بہتر دوست کی حیثیت سے پیش آیا۔
”تم اب فوراً بھٹا کھاؤ یہاں سے، کیونکہ تم یہاں موجود رہے تو ضرور کچھ گڑبڑ ہو گی، اور میں چینی یا نمک مرچ کے بجائے اس میں جھال گوتا ملا دوں گی۔“
”اگر میں نہ جاؤں تو؟“ منو نے اڑکھ کر کہا۔
”بھگودرنہ مار کھاؤ گے۔“ تمکین نے اسے وارننگ دی۔
”جا رہا ہوں، لیکن آپ کے ذرے نہیں بلکہ اس لیے کہ مجھے ہاتھ روم میں جانا ہے۔“ وہ کچن سے نکل گیا۔

وہ کتنی دیر تک زین سے ہونے والی ملاقات یاد کرتی رہی۔
”ہوں اچھے ہیں۔“ وہ بستر میں گھسی سوچ رہی تھی۔ ”کتنا اچھا ہوتا کہ میں نے اس دن انہیں غور سے دیکھ لیا ہوتا، لیکن مجھے کیا پتا تھا۔ بھلا ایک گراؤنڈ سٹوری کا۔“ وہ سوچتے سوچتے ہنس پڑی۔ ”بڑی بے وقوفی ہوئی تھی مجھ سے اس دن، اچھی بھلی سفید کار سامنے کھڑی تھی اور میرا دماغ ایسا کھانا پکانے میں لگا ہوا تھا کہ غور ہی نہیں کیا کہ سامنے منو نہیں ہے۔ وہ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ مجھے آنکھیں استعمال کرنے کی عادت نہیں ہے۔“ وہ پھر ہنس پڑی۔

”میں اس وقت سے دیکھ رہا ہوں بھو۔ آپ کچھ مشکوک سی حرکتیں کر رہی ہیں۔“ منو نے کتاب بند کر کے عادت کے مطابق عینک کے اوپر سے دیکھا۔
”وہ مجھے صوفیہ کی ایک بات یاد آگئی تھی۔“ اس نے جلدی سے بات بتائی۔ ”اور اب لائٹ آف کرو، مجھے نیند آ رہی ہے۔ اپنے کمرے میں جا کر پڑھو۔“ اس نے خلاف منہ کے اوپر رکھ لیا۔

”سمجھ تو میں گیا ہوں کہ صوفیہ نے کیا کہا ہوگا آپ سے۔“ اس نے شرارتی لہجے میں کہا۔

”کیا کہا ہوگا۔“ وہ خلاف کے اندر سے بولی۔

اعتراف نہیں ہے۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ امی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”کل زمین کی امی خود بھی آئیں گی۔“

”امی ایک بات میں بتاؤں۔“ وہ بولی۔ ”میں کسی ذرا سے یا فامی سین کی طرح جانے کی نرالی و تخلیق کرے میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے یہ بات بہت بری لگتی تھی۔ اول تو وہ مجھے تصویروں میں دیکھ چکی ہیں، لیکن اگر انہیں مجھے سانس لینے دیکھنے کا بہت شوق ہو تو میرے کمرے میں آ جائیں، میں ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔“

امی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ”اصولاً مہمانداری تمہیں کرنی چاہیے۔“

”اگر وہاں رشتہ طے ہو گیا تو بہتیری عمر پڑی ہے خدائیں خاطرین کرنے کے لیے لیکن ابھی نہیں۔ کم از کم جب تک باقاعدہ رشتہ طے نہیں ہو جاتا۔“ تمہیں نے صاف انکار کر دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ امی کے خیال میں اتنی سی بات مان لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ”وہ تم سے یہ رشتہ طے ہی سمجھو۔ ظفر نے ضمانت دی ہے اس کی۔ اور پھر وہ کچھ سوچ سمجھ کر ہی بھائی کا رشتہ ان کے گھر طے کر رہا ہے۔ اتنے اچھے رشتے روز روز نہیں ملتے۔“

”امی یہ لوگ لاہور میں رہتے ہیں یا کراچی میں؟“ تمہیں نے پوچھا۔

”میں لاہور میں گھبرگڑ توں رہتے ہیں، کراچی تو خدا کے رشتے کے سلسلے میں گئے تھے۔ ویسے بھی زمین کا کاروبار کراچی میں بھی ہے۔ وہ آتا جاتا ہی رہتا ہے، بہت گہرا دوست ہے ظفر کا۔“

امی کے جانے کے بعد تمہیں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور امی کے دیئے ہوئے لفافے سے تصویر نکالی۔ زمین مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تمہیں بھی مسکرا دی۔

”اللہ کرے جیسے آپ صورت شکل کے اچھے ہیں، ویسے ہی دل کے بھی اچھے ہوں اور عاداتوں کے بھی۔“ اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔

زمین کی امی اور بہن سب کو بہت پسند آئی تھیں۔ تمہیں سے تو وہ ایسے ملی تھیں، جیسے

”نہیں امی! وہ آہستگی سے بولی۔

”تو میری جان انہی اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ بیٹیاں اپنے والدین کے گھر سے عزت اور وقار کے ساتھ زحمت کی جائیں۔“ امی ایک لمحے کو کرکیں۔ ”اللہ کے فضل سے سیدہ اور اسما اپنے گھروں میں خوش زندگی گزار رہی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اب تمہارے فرض سے بھی سکدوش ہو جائیں۔“

”جی امی؟“ اس نے ایسے پوز کیا جیسے اسے کچھ خبری نہیں۔

”اس دن ظفر کا دوست آیا تھا زمین العابدین۔ تم نے دیکھا تھا نا اسے؟“

”جی، دیکھا تھا۔ لیکن سرسری انداز میں کچھ یاد نہیں ہے۔“

امی نے اسے زمین کی امی کے سیدہ آپا کے گھر اس کی تصویریں دیکھنے اور پسند کرنے کے متعلق اسے بتایا، پھر انہوں نے ایک لفافہ اس کی جانب بڑھایا۔ ”یہ تصویر ہے زمین کی، اچھا لڑکا ہے، تین چار سال قبل اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا، تب اس نے سارا برنس سنبھالا اور اب بہت کامیابی سے اسے چلا رہا ہے۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے بولیں۔ ”تم بھی سوچ لو۔ تمہاری مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں ہوگا۔“

”امی! اچھے کیا سوچنا ہے۔ آپ نے اور ابو نے جو کچھ کیا ٹھیک کریں گے۔“

”سعادت مندی اپنی جد، لیکن شادی کے معاملے میں لڑکی کی اپنی رائے بہت اہمیت رکھتی ہے۔“

”امی! رائے تو تب ہوگی، جب میں اس نظریے سے دیکھا ہوگا، ان کے متعلق کچھ جانتی ہوں گی۔ اب جب کہ مجھے ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہے تو بھلا کیا رائے دوں میں سوائے اس کے کہ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے، چاہے وہ جیسا بھی ہو۔“ ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے خیال آیا کہ وہ کالج میں کسی تقریری مقابلے میں رومترم کے پیچھے نہیں کھڑی بلکہ اپنے کمرے میں امی کے روبرو بیٹھی ہوئی ہے۔ ”مجھے آپ کے کسی فیصلے پر کوئی

”کیوں نہیں؟“ منو نے حیرت سے پوچھا۔

”بیوقوف، احق شادی سے پہلے لڑکیاں سرال کے پھیرے نہیں لگا پا کر تیں۔“

”پھر غیر پارلیمانی زبان کا استعمال۔“ منو چلایا۔ ”اور بجو یہ آپ جیسی لڑکیاں ہیں جو حقوق نسواں کے مشن کو شدید ترین نقصان پہنچا رہی ہیں۔ شادی سے پہلے سرال جانے سے کیا لڑکی کے پیٹ میں درد ہو جاتا ہے؟ میری جو بیوی ہوگی وہ شادی سے پہلے بھی یہاں ضرور آئے گی، بلکہ میرے ساتھ باہر گھومے پھرے گی، میں تو موصوف زین العابدین کی قسمت پر رور ہا ہوں جنہیں آپ جیسی سڑی ہوئی لڑکی ملے گی۔“

”تم لے کر آ جانا کوئی دیسی میم۔ میرے اپنے اصول ہیں۔“ تمکین نے اسے گھورا۔

”بھئی بات اصولوں کی نہیں ڈنر کی ہے۔ واہ واہ بریانی ہوگی، چکن روٹ ہوگا،

کباب ہوں گے اور آخر میں کوئی خاص قسم کا ڈیزرٹ۔“

”کیوں مینو تم نے تیار کیا ہے کیا؟“

”کسی بھی معقول ڈیزرٹ میں ان سب چیزوں کا ہونا اشد ضروری ہوتا ہے اور یہ یاد

رکھیں کہ آپ ان سب چیزوں سے محروم رہیں گی۔“

”تم کیوں میری فکر میں ڈیلے ہو رہے ہو۔“

”ویسے بجو آپ کو دیکھ کر لگتا نہیں ہے کہ آپ اتنی دقیقہ منشی قسم کسی چیز ہوں گی۔ ذرا

اپنے کانچے کی لڑکیوں کی طرف دیکھیں۔“

”کیوں کیا ہوا انہیں؟“

”ایک سے ایک پچھا ہے، خود آپ کی سہیلیاں رباب اور صوفیہ۔ انہیں ہی دیکھ

لیں۔“

”یہ بات کانچے کی نہیں ہوتی، میری جیسی کتنی لڑکیاں وہاں ہیں اور چائے تو تمہیں

اسلامیہ کانچے میں بھی مل جائیں گے۔ یہ بات ہوتی ہے مزاج کی، پردوش کی۔“

”بجو! ایک بات ٹھیک ٹھیک بتانا۔“

برسوں کی شناسائی ہو، پھر زین کی امی بھی ان لوگوں میں سے نہیں تھیں جو بزرگی کا چولا اوڑھے خشکیں نگاہوں سے نوجوانوں کو گھورتے رہتے ہیں، وہ بہت نرم خور خوش مزاج تھیں۔ ندا تو اسے دیکھتے ہی اس کی عاشق ہو گئی تھی۔

”آپ تو تصویروں سے بھی زیادہ اچھی ہیں۔ اتنی کیوٹ اتنی جائوسی۔“ اس نے والہانہ انداز میں کہا۔

”شکریہ! وہ مسکرائی۔

اس سے مل کر تقریباً ہر شخص پہلا تاثر یہی لیتا تھا کہ وہ بہت کیوٹ ہے۔ شاید اس کے چہرے پر نکھری مسکراہٹ اور شرارت سے چمکتی آنکھوں کی وجہ سے یہ کمپلی منٹ اس کے لیے نیا نہیں تھا۔

”اچھا تو گھر میں ہر طرف آپ کا ہنر نکھرا ہوا ہے۔“ ندا نے تبصرہ کیا۔

”یہ سب تو کانچے کے وقت کی بنی ہوئی چیزیں ہیں۔“ تمکین بولی۔ ”میں نے ہوم اکٹانکس کانچے سے پڑھا ہے۔“

”مجھے بتایا تھا امی نے اور امی کو بتایا تھا سیدہ آپا نے۔“ ندا بولی۔

وہ دونوں جلدی ہی بے تکلف ہو گئیں۔ ندا کو وہ بے حد پسند آتی تھی۔ دونوں کتنی دیر تک باتیں کرتی رہیں اور دونوں کی امیاں آپس میں مصروف گفتگو تھیں۔ وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔ باہر کار کا ہارن سنائی دیا۔

”اوہ زین بھائی لیئے آ گئے، ابھی تو بہت باتیں کرنی تھیں۔“ ندا بولی۔

”کوئی بات نہیں تم آتی رہنا۔ باتیں ہوتی رہیں گی۔“ تمکین نے مشورہ دیا۔

”ہاں اب تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔“ ندا ہنسی۔

جائے جاتے زین کی امی ان سب کو ڈرپراؤنا ایٹ کر گئیں۔

”پھر نچو مل رہی ہیں ناں ڈرپر۔“ منو اس کے پاس ادھکا۔

”جی نہیں۔“

”مقرر ہوتے جا رہے ہو۔“ تمکین ہنس پڑی۔

”نہیں بھو! میں سیرلس ہوں۔“ منو نے واقعی سنجیدگی سے کہا ”ایڈرز ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں اور عوام اکثریت میں۔ اور دنیا کے یہی راہنما، یہی اقلیت ہوتی ہے، جو معاشرے اور اصولوں کا رخ خود معاشرے اور اصولوں سے لاکر تبدیل کرتی ہے۔ اسی لیے قدریں بدلتی ہیں، انقلاب آتے ہیں، اکثریت تو محض پیچھے چلنے کے لیے ہوتی ہے۔ اس اقلیت کے پیچھے چلنے کے لیے جنہوں نے معاشرے سے ٹکرائی ہوتی ہے، جنہوں نے معاشرے کو ڈس اون کیا ہوتا ہے۔“

”فاؤل“، تمکین چلائی۔ ”یہ اکثریت اور اقلیت والی بات میں نے کہیں اور بھی پڑھی ہے، جسے تم ناک پر عینک دھرے بڑے فلسفیانہ موڈ میں مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”یہ آپ نے میری ڈائری میں انگریزی میں پڑھا ہوگا، لیکن پہلے یہ بتائیں کہ آپ نے میری ڈائری کیوں پڑھی۔“

”ایسا کون سا سیکرٹ لکھا ہوا تھا تم نے جسے میں پڑھ لیتی تو کوئی طوفان آ جاتا۔“ تمکین نے کہا۔ ”لیکن تم پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے کس کتاب سے یہ اقتباس متعارف کیا ہے؟“

”اس بات کو جانے دیں، دراصل سیکرٹ یہی تو ہے۔“ وہ بولا۔ ”لیکن میں آپ کی چالیس خوب سمجھتا ہوں، ہم بات کر رہے تھے ڈنر کی، جسے آپ مجھے خیاںوں تک میں نہیں کھانے دے رہیں۔“

”کس قدر پیچیدہ ہو تم۔“ تمکین نے اسے گھورا۔

اور پھر بہت جلد منگنی کی تاریخ طے ہو گئی۔ زیادہ چھان بھٹک کی ضرورت نہیں تھی۔ ظفر اور زین کے درمیان دوستی کا مضبوط رشتہ موجود تھا، جواب دہری رشتہ داری میں تبدیل ہو رہا تھا۔ ایک روز زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑی اور بالآخر منگنی ہو گئی۔

”پوچھو؟“

”کیا آپ کو یہ محسوس نہیں ہو رہا کہ امی اب آپ کو ایک ایسے شخص کے حوالے کر رہے ہیں۔ جسے آپ سرے سے جانتی ہی نہیں ہیں، جو پتا نہیں کیسا ہوگا، اس کی عادتیں، اس کا مزاج، نہ جانے کیسا ہو۔ آپ کی اس کے ساتھ انڈر اینڈنگ ڈیولپ ہو سکے یا نہیں۔“

”یہ سب کچھ کسی نہ کسی ذریعے سے معلوم ہو ہی جاتا ہے اگر اس وقت میں کالج میں رومزم کے پیچھے کھڑی کسی تقریری مقابلے میں حصہ لے رہی ہوتی تو یقیناً اس بات کے حق میں دلائل دیتی کہ لڑکے اور لڑکیوں کو ایک دوسرے کے مزاج سے آشنا ہونا چاہیے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ کالج کا اسٹیج نہیں ہے زندگی ہے اور زندگی میں ہمیں صرف اپنے لیے نہیں سوچنا ہوتا بلکہ اپنے سے منسلک تمام لوگوں کے لیے سوچنا پڑتا ہے۔ پھر ایک معاشرہ ہوتا ہے، جو ہر ایک کے لیے کچھ اصول وضع کر دیتا ہے، اگر آپ معاشرے کو ڈس اون (رد) کریں گے تو جواباً وہ بھی آپ کو ڈس اون کر دے گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ”کچھ دو اور کچھ لڑکے“ کے بغیر زندہ رہنا بہت مشکل ہے اور یہ کچھ لو اور کچھ دو کا اصول ہر رشتے پر لاگو ہوتا ہے پھر تمام مزاج آشنائی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ شادی سے پہلے لڑکا اور لڑکی کہتے بھی مزاج آشنا ہوں، وہ یہ لاکھ عمل تو نہیں کرتے ناں کہ شادی کے بعد وہ کیا چیز اپنی زندگی میں شامل کریں گے اور کس چیز کو رد کر دیں گے، پھر یہ سب کچھ بے کاری دکھائی دیتا ہے۔“

”بجوبگو کہ مجھے آپ کی باتوں سے بعض جلد شدید اختلاف ہے لیکن چلیں چھوڑیں اسے۔“ منو بولا۔ ”لیکن ایک بات ہے کہ آپ میں اتنی صلاحیت ہے کہ آپ اپنا حق حاصل کر سکیں لیکن نا آپ نے اپنے حقوق کا تعین ہی نہیں کیا اور آپ تو کچھ لو اور کچھ دو کی بھی قائل نہیں نکلیں۔ آپ نے اپنے اوپر صرف فرائض کو مسلط کر رکھا ہے۔ بجوب یہ بات یاد رکھیں کہ یہ معاشرہ جس کی ابھی آپ وکالت کر رہی ہیں۔ یہ اپنے والوں کو بیٹیں دیتا ہے۔ ہر رشتہ نبھاتا اور ہر فرض پورا کرنا محض ایک فرد کی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ میرا آپ کو مشورہ ہے کہ اپنے حقوق کا تعین ضرور کر لیں، پھر آپ انہیں حاصل بھی کر سکیں گی۔“

زمر دبائی کمرے سے چلی گئیں تو نگار نے مکمل منہ پر سے ہٹا دیا۔ یادیں، پاگل کر دینے والی یادیں اس کے وجود سے نکل کر اس کے چھوٹے سے کمرے میں ہر طرف پھیل گئی تھیں، اس کی زندگی کا سفر طبلے کی تھاپ پر اور پائل کی جھنکار کے ساتھ ہی شروع ہوا تھا۔ وہ خوش تھی، مطمئن تھی۔ طبلے کی تھاپ اسے بے خود کر دیتی تھی۔ پائل کی نرم جھنکار سن کر وہ جھل جاتی تھی لیکن اس وقت وہ بہت چھوٹی تھی اور وہ زمانہ اس کی بہنوں کا جمل، پائل اور زرقا کے عروج کا زمانہ تھا۔ جب وہ نوخیز طیلوں کی طرح ستار کے سروں پر ادھر ادھر ڈلتیں تو ہر طرف کوئی دل تھام کر رہ جاتا۔ وہ دونوں نگار کی آئیڈیل تھیں۔ نگار انہی جیسی بننا چاہتی تھی جن کے اُبرو کے ایک اشارے پر ہزاروں فدا ہو سکتے تھے، وہ اکثر انہی کی طرح پاؤں میں گھٹکھرو باندھ کر ان کی بیٹھی بیٹھی جھنکار سننے کو زمر دبائی ہنس پڑتیں۔

”کسی نے سچ کہا ہے، پوت کے پاؤں پالنے ہی نظر آ جاتے ہیں، میری نگار بہت آگے جائے گی، بہت لمبی اُڑان لے گی۔“

اور زمر دبائی نے اسے لمبی اُڑان لینے کے لیے تربیت دینی شروع کر دی۔ تک تک تھیں، تک تھیں، طبلے کی تھاپ پر نگار کا جسم کسی چمک دار شاخ کی طرح جل کھارہا تھا اور زمر دبائی کلفے میں پان دباے مستقبل کی حسین دنیاؤں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ بلکے سنبھلے بالوں اور سر زدہ کر دینے والی گرے آنکھوں کی مالکہ نگار، زمر دبائی کے لیے ایک ہیمر آتھی جسے وہ بہت محنت سے تراش رہی تھیں، اسے کوئی جلدی نہیں تھی، کا جمل، پائل اور زرقا ان کی موجودہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی تھیں لیکن وہ عام طوائفیں تھیں۔ تیس پینتیس سال کی عمر میں کچھ عمارت کی طرح زمین بوس ہو جانے والیں، نگار ان سب سے مختلف تھی۔ اسی لیے زمر دبائی اسے تربیت بھی مختلف دے رہی تھیں۔

طبلے کی تھاپ اور گھٹکھروؤں کی جھنکار ختم ہوئی تو زمر دبائی بھی خیالات کی دنیا سے باہر نکل آئیں۔

”دیکھا بانی جی! آپ نے؟“ استاد بندے علی فخر یہ انداز میں بولے۔ ”میں نہ کہتا

تھا کہ رب نے آپ کی جھولی میں ہیرا ڈال دیا ہے ہیرا۔ اب دیکھیں کیسے سنوارا ہے اسے میں نے کتنی خوبصورتی سے تراشا ہے، پورے بازار میں اس کا جوڑ ملنا ممکن نہیں۔“

”ابھی اس نے بہت پیچھے سیکھنا ہے استاد جی۔“ زمر دبائی نے سوری کھائی میں بندھے گجرے سے کھینچی نگار کی طرف دیکھا۔

”بچی ہے ابھی، اس لیے بہت لاپرواہ ہے۔ ابھی صرف اس کا جسم تاجتھا ہے، میں اس کی روح کو قفس کھٹانا چاہتی ہوں۔“

”بانی جی! میں تو بلی کی کے پہلے گجرے کے انتظار میں ہوں۔ دیکھنا کیا دھو میں چھیں گی شہر میں۔“ پیارے خان سارنگی نواز جوش بولا۔

”یہ گجر نہیں کرے گی۔“ زمر دبائی کے لیے میں سر دھری تھی۔

بندے علی اور پیارے خان ہونفوں کی طرح اسے دیکھنے لگے۔

”مجھے اسے عام تیرے درجے کے لوگوں کے حوالے نہیں کرنا۔ ذرا اس کا حسن دیکھیں استاد جی، یہ اپنے قص اور اپنے حسن کے سحر سے دنیا کو فتح کر سکتی ہے۔ یہ بہت خاص لوگوں کے لیے بہت خاص تحفہ ہوگی۔“ وہ بولیں۔ ”استاد جی! یہاں اسے جو کچھ سیکھنا تھا، اس نے سیکھ لیا۔ میں اسے بہت آگے تک لے جانا چاہتی ہوں، اسے کل ہی انجرامیں مہاراج سے قص کی تربیت دلوانے بھجوا دیں۔“ زمر دبائی نے پاندان بند کیا۔

انجرام جاتے ہوئے نگار کچھ گھبراہٹ تھی، عام لوگوں تک اس کی رسائی نہ ہونے کے برابر تھی۔ محفل گننے کے وقت بھی وہ اپنے کمرے میں بند رہتی تھی۔ زمر دبائی ابھی اسے کسی کے سامنے لے جانا نہیں چاہتی تھیں پہلے وہ اسے برہنہ طور پر مکمل بنانا چاہتی تھیں۔ نگار کی دوستی صرف اپنی بہنوں سے تھی اور دلچسپی صرف گھٹکھروؤں اور کتابوں سے، آج اسی لیے اسے گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی کہ نہ جانے کیسے لوگ ہوں وہاں۔ پھر اس نے خود ہی دل کو تسلی دی۔

ظاہر ہے، میرے جیسی لڑکیاں ہی ہوں گی، میرے محلے کی نہ سہی، لیکن اب تو شہر

نازش بولی۔

”آپ بھی یہاں قرض سیکھنے آئی ہیں؟“ نگار نے پوچھا۔

”بس یونہی۔ نام بھی یاس ہو جاتا ہے اور اگر کسی کو معلوم ہو کہ ہم قرض سیکھ رہے ہیں تو داد بھی بہت ملتی ہے۔“

”کوئی نہ کوئی ایسی انکسٹیٹیو ہوتی دینی چاہیے۔“ مونانے کہا۔ ”تھوڑی ورزش بھی ہو جاتی ہے۔“

”آپ قرض کے علاوہ کیا کرتی ہیں؟“ نازش نے اس سے پوچھا۔

”پڑھتی ہوں۔“ اس نے مختصراً کہا۔ وہ یہاں کسی سے بھی لمبی گفتگو میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

”کس کالج میں؟“

”میں پرائیویٹ پڑھ رہی ہوں۔“

”اچھا اچھا۔ اور آپ کے ڈیڑی کیا کرتے ہیں؟“ نازش غالباً اس سے تفصیلی انٹرویو لینے کے پیکر میں تھی۔

”وہ.....“ نگار ایک لمحے کو جھنجکی پھر عام سے لہجے میں بولی۔ ”وہ ملک سے باہر ہوتے ہیں انٹینس میں۔“ پھر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں جانتی ہوں۔ بی بی منی منتظر ہوں گی۔“

”آپ اب روزانہ آئیں گی نا؟“ مونانے پوچھا۔

”جی!“ کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

مونانہ اور نازش کا معمول تھا کہ وہ نگار کا قرض ضرور دیکھتی تھیں اور بعد میں اس سے باتیں کرتی تھیں اور نگار ذاتی سوالات کی زد سے بچنے کی خاطر جلد از جلد ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ یہاں کسی سے بھی زیادہ فری نہیں ہونا چاہتی تھی، یہاں کی لڑکیوں نے اسے خود ہی کسی بہت امیر کبیر شخص کی بیٹی سمجھا شروع کر دیا تھا۔ وہ انہیں اس

میں جگہ جگہ میرے بیسی لڑکیاں موجود ہیں۔ اور بہت بھی لڑکیاں قرض سیکھنے آئیں تب بھی کتنی ہوں گی، صرف دو چار۔ تو ان سے کیا گھبراہٹ یا جھجک لیکن یہ دیکھ کر اسے بہت حیرت ہوئی کہ وہاں اچھے اچھے خاندانوں کی بہت سی لڑکیاں قرض کی تربیت لینے آئی ہوئی تھیں، پر ان میں سے کسی کو قرض کی ایجاد سے بھی واقفیت نہیں تھی۔ وہ کتنی دیر تک انہیں دیکھ کر دل ہی دل میں ہنسی رہی، پھر جب اس نے پاؤں میں گھٹنگرو باندھ کر قرض شروع کیا تو سب ہی اس کی جانب دیکھتے رہ گئے۔

”یہ اپرا سورگ سے دھرتی پر کیسے آئی۔“ اسے قرض کرتے دیکھ کر مونانے حیرت سے کہا۔ ”ضرور اسی مینکا نے وشواتر کی تپا بھنگ کی ہوگی۔“

اس وقت نگار ایک طرف بیٹھی گھٹنگرو اتار رہی تھی کہ مونانہ اور اس کی کزن نازش اس کی طرف چلی آئیں۔ نگار نے نگاہیں اٹھا کر ان دونوں کی جانب دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

”آپ یقیناً مینکا ہوں گی اور اگر نہیں ہیں تو آپ کو مینکا ہونا چاہیے۔“ مونانے مسکرا کر کہا۔

”میں سمجھی نہیں۔“ نگار نے اپنی سر زدہ کر دینے والی گرے آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

”مجھے حیرت ہے کہ آپ اپنے آپ سے اس قدر بیگانہ ہیں کہ کچھ نہیں سمجھیں۔“ مونانے اس کی سحر آنکھوں کو دیکھا۔ ”آپ تو اپنے نرت سے کسی بھی مہارشی کی ساری عمر کی تپا بھنگ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔“

نگار ہولے سے ہنس پڑی۔ یوں لگا جیسے جلتے تگ بج اٹھے ہوں۔ ”نہیں نہ تو میں کوئی اپرا ہوں، اور نہ اندر دیوتا کی سورگ سے یہاں آئی ہوں۔ میں تو ہمیں تنگ و تار یک گلیوں میں پٹی ہوں، جہاں نہ میر وہی پہاڑی ہے اور نہ سونے اور جواہرات کے محل۔“

”حالانکہ اصولاً آپ کے لیے سونے اور جواہرات کے محل ہی ہونے چاہئیں۔“

پریشانی میں مبتلا رہتی ہیں کہ زمانہ بہت خراب ہے۔ انہوں نے مجھے میرے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر ادھر رقص کیلئے کی اجازت اسی شرط پر دی تھی کہ میں یہاں کسی سے کوئی فالٹ بات نہیں کروں گی۔“

”اچھا۔ اسی لیے تم چپ چپ رہتی ہو۔“ نازش ہنسی۔ ”اور سب یہ سمجھتے ہیں کہ تم بہت مغرور ہو۔ خیر ہم بھی پھر دھن کے کپکے لنگھنا۔ ہم نے پہلے ہی دن تجھے کیا تھا کہ تم سے دوستی کرنے کی اور دیکھ لو ہم کا میاب رہے۔“

”ویسے کتنی تو نگار کی می بھی ٹھیک ہیں۔ آج کل تو کوئی معیار نہیں ہے لیکن جہاں کچھ برے لوگ ہوتے ہیں، وہیں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔“ مونانے گویا بات ختم کر دی۔

لیکن اس دن بات ختم نہیں ہوئی تھی، دراصل شروع ہوئی تھی، جتنا تو درحقیقت نگار کی زندگی کا پہلا باب ہوا تھا، اور ایک نئے باب کی ابتدا ہوئی تھی۔ وہ تینوں لہجہ سے آکھنٹی باہر نکلی تھیں۔ اتفاق سے نگار کی کار بھی ان کی کار کے بالکل ساتھ ہی پارک تھی اور آج اس میں ڈرائیور کے علاوہ زمر دہائی بھی موجود تھیں۔

”اوہو!“ نگار نے سوچا۔ ”یہ دونوں اب اماں سے ملے بغیر نکلنے والی نہیں ہیں۔ ان دونوں سے نفی کتنا ہی بہتر ہے۔“

وہ چلتے چلتے رگ لگی اور جوتا ٹھیک کرنے کے بہانے وہیں ٹھہر گئی لیکن مونانے اور نازش بھی اسے رکھنے دیکھ کر رک گئیں۔

”کیا ہوا؟“ مونانے پوچھا۔ ”کیا جوتا کاٹ رہا ہے۔“

”ہاں جوتا چھ رہا ہے۔“ اس نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا اور سیدھی ہو گئی۔

اس ہنگامی صورت حال سے ٹھنکنے کے لیے اسے یہی اکلوتا منصوبہ سوچا تھا جو بری طرح فیل ہو گیا تھا۔ اس نے دونوں سے جان چھڑانے کے لیے ایک مرتبہ پھر ذہن پر دستک دی، لیکن بے کار۔ بالآخر وہ تنہا ہی رہ کر کار کی طرف چل پڑی۔

”تمہاری می بھی آج ساتھ ہیں؟“ نازش نے پوچھا۔

غلط فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتی تھی، لیکن ساتھ ہی اسے ڈرتھا کہ کسی قریبی دوستی کی صورت میں اس کا راز بہت دن تک برقرار نہیں رہے گا، جس کی وہ مطمئن نہیں ہو سکتی تھی۔

لیکن کب تک؟ مونانے اور نازش بھی اس معاملے میں بہت ڈھیٹ ثابت ہوئی تھیں۔ وہ نگار سے دوستی کی خواہش نہ تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ ان دونوں کی عادی ہو گئی اور ان کے درمیان آشنائی سے بڑھ کر دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ نگار کو بھی وہ بہت اچھی لگتی تھیں۔ ان کی باتیں سادہ سی ہوتیں، گھڑیلو لڑکیوں والی۔ ان میں قدرے شوخی ہوتی جو کالج لائف نے ان میں بھر دی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر خلوص تھا جس کا نگار کے اپنے معاشرے میں فقدان تھا۔

وہ اس سے ڈھیروں باتیں کرتی تھیں۔ انہی کی باتوں سے اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ دونوں کزنز ہیں اور ان دونوں کے والد بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ نازش کی می مزاج کی قدرے سخت ہیں لیکن مونانے کی می نے گھر اور اولاد کے سلسلے میں زیادہ تردد کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ان کے گھر میں ہر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر تقریباً خود مختار زندگی گزارتا ہے اور یہ کہ مونانے کا ایک بھائی سعد ہے جو اس کے پاپا کے بار بار کہنے کے باوجود بھی بزنس کی طرف توجہ نہیں دیتا اور اپنا زیادہ تر وقت شکار کھیلنے میں گزارتا ہے۔

”تم کبھی چلوٹاں میرے گھر۔“ مونانے آخر اس سے اصرار کرتی۔

”کبھی وقت ہوا تو ضرور چلوں گی۔“

”اچھا تو ہمیں ہی اپنے گھر لے چلو۔“ نازش ہنستی۔

”میری می تمہاری می سے کہیں زیادہ سخت ہیں۔ اتنی مشکلوں سے تو انہوں نے اجازت دی ہے یہاں آنے کی۔“ پہلے پہل اسے جھوٹ بولنے میں وقت ہوتی تھی لیکن اب وہ بہت روانی سے کہانی گھڑ لیتی تھی۔

”تو کیا تمہاری دوستوں کا تمہارا گھر آنا منع ہے؟“

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔“ نگار بولی۔ ”اصل میں میری می ہر وقت اس

”ہاں۔“

”چلو مونا، آئی سے ذرا نیلو ہائے کر آئیں۔“

مونا اور نازش کار کی اس کھڑکی کے پاس چلی آئیں۔ جہاں زمر دہائی بھیجی ہوئی

تھیں۔

”السلام علیکم آئی! ہم نگار کی دوست ہیں۔ میں مونا ہوں اور یہ نازش۔“

”بہت خوشی ہوئی ہے آپ سے مل کر۔“ زمر دہائی نے دونوں کے سر پر ہاتھ بھیرا۔

”آئی! ہم نے نگار سے بہت مرتبہ اصرار کیا ہے اپنے گھر آنے کے لیے لیکن یہ

بیش کوئی نہ کوئی بہانا بنا دیتی ہے۔“ مونا بولی۔ ”کبھی مے کی اجازت نہیں دیتیں۔ آپ

چلیز اجازت دے دیں ناں۔ چاہے صرف ایک مرتبہ۔“

”اے واقعی میں اجازت نہیں دیتی لیکن اس وجہ سے کہ مجھے پتا نہیں تھا کہ اس کی

اتنی اچھی اتنی پیاری سہیلیاں ہیں۔ اگر مجھے پتا ہوتا تو میں ضرور اجازت دے دیتی۔“

”آئی! اب تو پتا چل گیا ناں؟“ نازش ہنسی۔

”ہاں، اور اب اجازت بھی دے دی۔“ زمر دہائی بولیں۔

”جھیک یو آئی۔“ پھر مونا نگار کی طرف مڑی، جو ان کے قریب ہی چپ چاپ

کھڑی ہوئی تھی۔ ”بولو اب کب آنے کا ارادہ ہے؟“

”ہاں، اب کوئی بہانا نہیں چلے گا۔“ نازش بولی۔

”میں نے کب کوئی بہانا بنایا ہے۔“ نگار پھلکی سی مسراہٹ سے بولی۔ ”پہلے مے کی

اجازت نہیں تھی اس لیے نہیں آئی۔ اب اجازت مل گئی ہے تو جیسے ہی وقت ملا آ جاؤں

گی۔“ اس نے اب بھی بات نالنے کی کوشش کی۔

”وقت نہ ہونا تو محض بہانا ہوتا ہے، دوستوں کے لیے وقت نکالنا پڑتا ہے۔ کیوں

آئی؟“ مونا نے زمر دہائی کی طرف تائید طلب نگاہوں سے دیکھا۔

”بالکل درست۔“ وہ بولیں، پھر نگار سے مخاطب ہوئیں۔ ”تم نے کون سے ایسے

کام نمٹانے ہوتے ہیں جن سے تمہارے پاس وقت ہی نہ بچے۔ کسی دن یہیں سے اپنی

سہیلیوں کے گھر ہو آؤ۔“

”ہائے آئی! آپ سنی اچھی ہیں۔“ نازش چلائی۔

”ہاں کسی دن کیوں کل ہی ہمارے ساتھ چلی چلو۔“

”کل تو مجھے۔“ نگار نے دل ہی دل میں کوئی بہانا سوچنے کی کوشش کی۔

”چلی جاؤ ناں اس قدر پیار سے کہہ رہی ہیں۔“ اسے متعزذب دیکھ کر زمر دہائی

نے کہا۔ ”چلی کل یہ میں نے کہہ دیا ہے۔“

گھر آ کر وہ زمر دہائی پر برس پڑی۔

”اماں کی ضرورت تھی آپ کو ان کی بات ماننے کی۔“

”سمجھا کرو ان باتوں کو، اب تم پہنچی نہیں ہو۔ تمہاری عمر میں تو یہ تینوں کہاں کہاں پہنچ

چکی تھیں۔ بڑے بڑے سیٹھ ہماری چوکھٹ سے ملنے کا نام نہیں لیتے تھے اور ایک تم ہو،

جسے کسی اونچ نیچ کی کچھ خبر ہی نہیں ہے۔“ زمر دہائی نے پان بناتے ہوئے اسے گھورا۔

”بڑے گھر کی لڑکیاں ہیں، ایسے لوگوں سے دوستی بڑھانی چاہیے۔“

”اماں یہ ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ رو بانسی ہو گئی۔ ”اگر میں ایک مرتبہ ان کے گھر گئی تو

مجھے بھی ایک مرتبہ انہیں اپنے گھر بلوانا ہوگا۔“

”تو کیا ہوا؟ بازار حکیمان میں تو بڑے بڑے لوگوں کی حویلیاں ہیں۔ آج گلبرگ

اور ڈیفنس چلے گئے ہیں تو کیا ہوا؟“

”لیکن یہ تو بازار حکیمان نہیں ہے۔“ وہ چڑ گئی۔

”ذرا سہی تو ہٹ کر بے اس سے، نئے آنے والوں کو تو پتا ہی نہیں چلتا کہ کہاں

سے بازار حکیمان کی حد ختم ہوئی اور کہاں سے ہمارا محلہ شروع ہوا۔“ اماں کے لیے تو جیسے

یہ مسئلہ ہی نہیں تھا۔

”اماں یہ تو سوچیں کہ میں محفلوں میں شامل نہیں ہوتی تب بھی آپ نے جو میری اتنی

کھاؤ گی۔“

”پتا نہیں آپ لوگ کیا کہہ رہی ہیں، مجھے تو صرف اتنا پتا ہے کہ مونا اور نازش بہت اچھی ہیں اور اگر انہیں میری اصلیت کا پتا چلا تو انہیں بہت دکھ ہوگا۔“

”دوسروں کے دکھوں کی پرواہ کرتی رہیں تو خود زخمی ہو جاؤ گی۔“ پائل نے مربیابہ انداز میں کہا۔

”اور کیا خود ان کے باپ اور بھائی ہم جیسوں کے پاس نہیں آتے ہوں گے؟“

زمر دبائی بولی۔ ”خود انہیں بھی سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔“

”اماں آپ لوگ کیا بحث کرنے لگے۔“ زرقا اُکستا گئی۔ ”ابھی بچی ہے یہ بالکل۔ آہستہ آہستہ سب سمجھ آ جائے گی اسے۔“

”اتنی بچی بھی نہیں ہے۔“ زمر دبائی نے کہا۔ ”اب اسے یہ باتیں سمجھنی چاہئیں۔ کل کو اسے برلن میں آنا ہے۔ اس کی عمر بتنی لڑکیاں کیا کر رہی ہیں، یہ تم لوگ بھی جانتے ہو۔“

”اماں! اسے تربیت بھی تو آپ دے رہی ہیں۔“ کاہل ہنسی۔ ”اس کی عمر میں ہم تو دھو میں چپا چکے تھے پورے بازار میں۔“

”اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ زمر دے نگار سے کہا۔ ”اور اس مسئلے پر زیادہ پریشان مت ہونا۔ مونا اور نازش تمہاری کامیابی کے راستے کی سیڑھیاں ہیں اور سیڑھیاں محض راہ گزر ہوتی ہیں دوست نہیں۔“

وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے اماں کی یہ منطق سمجھ میں نہیں آ سکی تھی، رات کو دیر تک طبلے اور گھنگھر دوں کی مہر آوازیں سننے سننے وہ اس مسئلے پر غور کرتی رہی لیکن اسے کوئی حل سمجھ میں نہیں آیا۔ اور پھر نہ جانے کب وہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔

اگلے دن جب وہ ان دونوں کے ساتھ مونا کے گھر میں داخل ہوئی تو ایک لمحے کے لیے ٹھک کر رہ گئی۔ وہ جھگڑا کوٹھی نہیں محل تھا۔ اتنی نفاست اور اتنی خوبصورتی تو اس نے فلموں کے نقلی سیٹوں میں بھی نہیں دیکھی تھی۔

بڑی تصویر بیکھک میں لگا رکھی ہے، اس کی وجہ سے اگر کسی نے مجھے وہاں پہچان لیا یا نہیں کسی طرح معلوم ہو گیا کہ میرا تعلق اس علاقے سے ہے تو کیا ہوگا؟“

”یہ برا تو نہیں ہوگا بلکہ بہت اچھا ہوگا۔ جدی پیشی کا رد ہاں ہے یہ ہمارا۔ چاوڑی بازار میں عیدن ہائی کے بعد ہمارے ہی کوٹھے کا نمبر آتا تھا۔ اور خود عیدن ہائی کیا تھی، ایک ہی ایک نگلی تھی اپنے پورے خاندان میں ورنہ اس سے پہلے تو خاک عزت نہیں تھی ان کی پورے بازار میں۔“ زمر دبائی نے گلے میں پان دبایا۔

”آپ تو بات پتا نہیں کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔“ نگار نے ہونٹ کاٹے۔

”لڑکی باولی کیوں ہوتی جاتی ہے۔ یہ جو سارے برلن میں اور ٹیٹھ کہا جاتے ہیں۔ مجھے سب کی حقیقت کا پتا ہے اگر انہیں پتا چل گیا کہ کٹھیاں کی ہے تو سمجھ کہ تیری قسمت جاگ جائے گی۔ ویسے بھی میں اب تجھے برلن میں لانے کا سوچ رہی ہوں۔“

”لیکن اماں! مونا اور نازش میری سیلیاں ہیں۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گی؟“

”بڑی سوچا کریں، تجھے کیا۔ ایک بات یاد رکھنا ہمیشہ۔ اس دنیا میں سب اپنے مفاد کے دوست ہوتے ہیں۔ کوئی انسان اس وقت تک کسی سے دوستی نہیں کرتا جب تک اس کا مفاد دوسرے سے وابستہ نہ ہو۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے، انہوں نے بھلا مجھ سے کیا لینا دینا۔ کوئی کمی نہیں ہے ان کے پاس کہ مفاد کی خاطر مجھ سے دوستی کریں۔ نہیں اماں، انہیں تو منہ سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ کچھ کہنے سے بھی پہلے ان کی خواہشیں پوری ہو جاتی ہیں۔“

”تم نے ابھی دیکھا نہیں دیکھی ہے۔“ پائل سگھار کرتے ہوئے بولی۔ ”اپنے کمرے میں بیٹھے رہنے یا چند سیل کا فاصلہ طے کر کے انہما اپنے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم نے لوگوں کو سمجھنا شروع کر دیا ہے، ابھی تو تمہیں بہت کچھ دیکھنا ہے لڑیا۔ خود غرضی، بے ایمانی اور بدنیتی کا تمہیں اس وقت پتا چلے گا، جب تم اس دنیا میں پہلا قدم رکھو گی، اور پہلی ٹھوکر

”آؤ ناں۔“ اسے رکنا دیکھ کر مونا بھی رک گئی۔

”آں ہاں۔“ وہ جیسے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی۔

وہ تینوں ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ اس دن نگار کو بہت شدت سے احساس ہوا کہ دوستی کس قدر خوبصورت رشتہ ہے۔ ان دونوں کے علاوہ اس کی اور کوئی دوست نہیں تھی۔ اسے اب بھی اماں اور پائل کی کل کی باتیں یاد کر کے غصہ آ رہا تھا۔ جن کے نزدیک دوستی محض مفاد کا نام تھا۔ اور دوست کی حیثیت راہ گزر سے زیادہ نہیں تھی۔ یوں جیسے آپ کی وابستگی انسان سے نہ رہی ہو بلکہ آپ راستے کے اینٹ پتھروں سے نیلو بائے کر کے آگے بڑھ گئے ہوں۔

نازش اور مونا دونوں کی زبان مسلسل چل رہی تھی وہ اسے کالج اور گھر کے قصے بغیر رکے سنائے جا رہی تھیں۔ سنانے کے لیے نگار کے پاس بھی بہت سے قصے تھے لیکن وہ اس محفل میں سنانے کے لیے نہیں تھے، اس لیے وہ صرف سنتی رہی۔ ان دونوں کی باتیں کتنی سادہ تھیں اور وہ کالج کے چھوٹے چھوٹے بے ضرر قسم کے افیئر رکتنی وچپسی سے اسے سنارہی تھیں۔ اسے ان دونوں کی معصومیت پر ہنسی آگئی۔

”قسم سے گھنٹوں دھوپ میں پڑا سڑتا رہتا ہے وہ غالب۔ مجال ہے جو کبھی کسی نے اسے انجینئرنگ یونیورسٹی میں دیکھا ہو، سارا دن لاہور کالج کے باہر ہوتا ہے اور رابہ بھی اسے جی بھر کے تنگ کرتی ہے۔“ مونا جوش سے کہہ رہی تھی۔

”ہاں، وہ بے چارہ تو بہت ہی عاشق صادق قسم کی چیز لگتا ہے لیکن جو نو رین اور فرحان کا چکر ہے یہ مجھے مزید چٹا نظر نہیں آ رہا۔“ نازش بولی۔ ”مجھے تو لگتا ہے جیسے دونوں ہی وقت گزاری کر رہے ہوں۔“

”ہاں، دو کو تو نو رین پہلے منما چکی ہے اور فرحان تو حکل سے ہی فلرٹ لگتا ہے۔

گاڑی میں نو رین کو بٹھایا ہوتا ہے اور نظر باہر چلتی پھرتی لڑکیوں پر ہوتی ہے۔“

”پھر؟“ نگار بولی۔

”تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟“ نازش کو اس کے حیران نہ ہونے پر حیرت ہو رہی تھی۔

”حیرت کی بات تو ہے۔“ نگار نے ایک دم بات بنائی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسے

کچھ خاص حیرت نہیں ہوئی تھی، جس جگہ سے اس کا تعلق تھا وہاں یہ باتیں کچھ ایسی حیران کن نہیں تھیں، ہاں جس ماحول سے مونا اور نازش کا تعلق تھا۔ وہاں یہ نہ صرف حیران کن تھیں بلکہ معیوب بھی تھیں۔

”کیسا مزہ آتا کہ تم پرائیویٹ پڑھنے کے بجائے ہمارے ساتھ کالج میں ہوتیں۔“

مونا بولی۔ ”پڑھنے تو صرف سائنس کے اسٹوڈنٹ ہیں، ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ کس کا افیئر کہاں چل رہا ہے اور اس پر شرط لگاتے ہیں کوک اور سینڈوچ کی۔“

”یہ تو نہ کہو کہ ہم آئرش والے پڑھتے نہیں ہیں۔“ نازش بولی۔ ”یہ کہو کہ تم نہیں پڑھتیں۔“

”چلو ایسا ہی سہی۔“ مونا ہنسی پھر وہ نگار سے مخاطب ہوئی۔ ”اور نگار ابھی تو یہ بس

عام سے ہی قصے ہیں۔ کبھی خاص قصے بھی سناؤں گی۔“

”اچھا ابھی کچھ خاص قصے بھی ہیں۔“ نگار کی ہنسی پھر چھوٹ گئی۔

ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتا ہوا سعد نگار کی ہنسی کی جلتے تنک سن کر ٹھٹک گیا۔ وہ

ڈرائنگ روم میں مونا اور نازش کے ساتھ قالین پر بیٹھی ہوئی تھی، ایک کشن اس کی گود میں

تھا۔ ہنستی ہوئی وہ اس قدر خوبصورت لگ رہی تھی کہ سعد اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اگرچہ

نگار نے ابھی تک باقاعدہ اس دنیا میں قدم نہیں رکھا تھا لیکن وہ اس قدر بے خبر بھی نہیں

تھی۔ اپنے چہرے پر سعد کی نگاہوں کی حدت محسوس کر کے اس نے دروازے کی جانب

دیکھا وہ اہلانا انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نگار کی نگاہوں کے تقاب میں مونا اور

نازش نے بھی دروازے کی سمت دیکھا۔ سعد کو اس طرح دیکھنا پا کر وہ مسکرا دیں۔

”میرا بھائی تو گیا کام سے۔“ مونا نے آہستہ سے کہا اور بس پڑی۔

نگار یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

خنک تھی اور تارے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ ان کے چوہارے کے ساتھ ہی نچو کا چوہارہ تھا۔ وہاں سے مدھم مدھم سرگوشیاں اور دہلی ہنسی کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ نگار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اگر یہ سب باتیں وہ مونا اور نازش کو بتا دیتی تو حیرت کے مارے ان کا شاید ہارٹ ہی فیل ہو جاتا۔

اگلے دن کھٹک کی کلاس میں مونا اور نازش سے یوں ملی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ایک بار پھر ان کے وہی قصے تھے اور وہی بے نگہری سے بھرپور تہقہ۔ کلاس کے انتقام پر جب وہ باہر نکل کر اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ رہی تھیں تو مونا کی سیاہ بیوک کے ساتھ سعد کو ٹیک لگائے دیکھ کر اسے قدرے حیرت ضرور ہوئی تھی لیکن اس قسم کے معاملات میں حیرت ظاہر کرنا اس کی تربیت میں شامل نہیں تھا۔ سو وہ مونا اور نازش کو دوش کر کے بے نیازی سے اپنی کاری طرف بڑھ گئی۔ اس کے خیال میں اسی میں عافیت تھی۔ سعد اس کی پشت پر ہلکے سہرے بالوں کی بل کھائی لمبی سی چوٹی میں ہی اُلجھ کر رہ گیا۔

اور پھر تو یہ معمول ہو گیا پہلے مونا اور نازش خود آتی تھیں یا ڈرائیور نہیں جھوڑ جاتا تھا۔ لیکن اب یہ ڈیوٹی سعد انجام دیا کرتا تھا۔ دوسری طرف مونا اور نازش سے دوستی مزید گہری ہونے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ان کا یہ اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ نگار ان کے گھر آئے۔ وہ مسلسل بہانے سے انہیں ٹال رہی تھی۔

”یار! تم سے تو کم از کم یہ امید نہیں تھی۔“ ایک دن نازش نے کہا۔ ”نہ تم ہمارے گھر آتی ہو اور نہ کبھی اپنی طرف مدعو کیا ہے۔“

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ نگار ایک مرتبہ پھر کوئی بہانا سوچنے لگی لیکن کچھ سمجھ نہ آیا تو بالآخر بالبدلتا خواستہ بولی۔ ”تم لوگ جب چاہو میری طرف آ جاؤ۔“

”تو پھر کل ہی چلتے ہیں۔“ مونا تو جیسے تیار مٹی تھی۔ ”ہم بھی تمہاری میزبانی سے

لطف اندوز ہوں۔“

”ضرور۔“

”کیا ہوا؟“

”بہت دیر ہو گئی ہے مجھے بھی انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”کچھ دیر تو ٹھہرو۔“ مونا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”پھر کسی دن۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”وہ اپنی اتنی اچھی سہیلیوں کو کھوٹا نہیں چاہتی تھی جن کی باتوں میں سادگی تھی، خلوص تھا، شوقی تھی اور جو نازل زندگی سے اسے متعارف کرانے کا واحد ذریعہ تھیں۔ وہ گھر پہنچی تو زرد بانی اس کے سر پر پہنچ گئیں۔

”گاڑی تو کافی لمبی ہے ان کی، گھر کیسا ہے؟“

”بس ٹھیک ہے۔“ نگار نے بیزاری سے کہا۔

”بزئس تو خاصا بڑا ہے۔“

”ماں، مجھے کیا پتا۔“

”باپ یا کسی بھائی پر نظر پڑی؟“

”ماں۔“ وہ غصے سے صرف ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ ”نہیں کسی پر نظر نہیں پڑی۔“

”سیج کچے سو بیٹھا ہو۔“ زرد بانی نے پاندان کھولا۔ ”اچھا ہے دھیرے دھیرے قدم

آگے بڑھاؤ۔ جلدی کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، النامستے ہوتے ہیں۔“

وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

”ماں کو تو بروقت صرف ایک ہی بات سمجھتی ہے انہیں بزئس سے غرض ہے۔

انسان چاہے جائیں بھڑا میں۔“ وہ غصے میں بڑبڑاتی ہوئی مسہری پر گر گئی۔ ”وہ میری

سہیلیاں ہیں، کیا میں ان کے بھی باپ اور بھائیوں پر نظر کھنا شروع کر دوں۔ چھی چھی۔“

تھوڑی ہی دیر میں فضا میں موسیٰ کی مہک پھیل گئی۔ طبلے پر تھاپ پڑی اور

گھنگھر ووس کی جھنکار ہر طرف پھیل گئی۔ رقص و موسیقی نگار کو ہمیشہ بُد سکون کر دیتے تھے۔

کچھ ہی دیر میں اس کی منتشر سوچیں اور پریشان خیالی ختم ہو گئی۔ وہ باہر صحن میں نکل آئی، ہوا

”یہ بھی برائیاں ہیں۔ لیکن۔“ پھر وہ قدرے توقف سے بولی۔ ”اوکے۔ یہ بتاؤ کہ باہر ڈنکا ارادہ کہاں ہے؟“

”جگہ کا تعین تم دونوں کرو گی۔ میں تو پہلے ہی اس قدر شرمندہ ہوں کہ کیا بتاؤں۔“ نگار بولی۔

”نہیں یار۔ نو پر اہلم۔ ہمیں بھی اچھا نہیں لگے گا کہ ہم تینوں بیٹھے ہوں اور ہمارے ارد گرد بچے کھل کر رہے ہوں۔“

”تھینک یو۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں تم مائنڈ نہ کرو۔“ نگار نے ممنونیت سے کہا۔

”نہیں مائنڈ نہ کیا۔“

”اچھا تو اب کلاس میں ملاقات ہو گی۔“ نگار نے اطمینان کی سانس لی اور فون رکھ دیا۔

کلاس کے اختتام پر وہ باہر آئیں تو مونا نے گھڑی دیکھی۔ ”ابھی تو ڈنر میں بہت وقت ہے۔ اتنی دیر میں کیا کریں۔“

”تمہاری طرف چل کر بیٹھتے ہیں۔“ نازش نے تجویز دی۔

مونا نے سوالیہ نگاہوں سے نگار کو دیکھا لیکن وہ وہاں جانا نہیں چاہتی تھی اس لیے فوراً بولی۔ ”لاگ ڈرائیو کیسی رہے گی؟“

”گڈ آئیڈیا۔“ وہ دونوں چلاں گئیں۔

”تم اپنے ڈرائیو کو چلا کر۔“ نازش بولی۔ ”ورنہ کوئی فائدہ نہیں لاگ ڈرائیو کا۔“

نگار نے ڈرائیو کو رخصت کر دیا اور خود اسٹیرنگ سنبھال لیا اور پھر وہ تینوں ڈیک پر اونچی آواز میں Hit between the Eyes کے ساتھ سر ملاتی لاہوری کی مختلف سزکوں پر چکر لگانے کے بعد بالآخر سن کو آگ جا بچیں۔ سن کو آگ نازش کی چوائس تھی۔ ابھی وہ چکر کارن سوپ سے لطف اندوز ہو رہی تھیں کہ مونا کالج میں ہونے والے چند نئے چکر دن پر بحث کر رہی تھی۔ جب اچانک نگار کی نگاہ اپنے سامنے لگے آئینے پر پڑی۔

گھر پہنچ کر وہ اسی پریشانی میں جتلا رہی کہ کل کیا بہانا کرے۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ انہیں یہاں نہیں لاسکتی تھی اور یہ بھی کہ اب مزید بہانوں کا مطلب یہی ہوگا کہ اس کی اتنی اچھی سہیلیاں اس سے بدگمان ہو جائیں گی اور شاید اس کے متعلق کیا سوچنے لگیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے اگلے دن نازش کو فون کیا۔ اتفاق سے فون اسی نے رسیو کیا۔

”میں حیرت سے مر جاؤں گی۔ تم نے کیسے فون کر لیا؟“

”بس یونہی باتیں کرنے کو دل چاہ رہا تھا اور ایک انفارمیشن بھی دینی تھی۔“

”ہوں، تو اصل بات یہ ہے کہ تم نے کوئی انفارمیشن دینی تھی۔ باتیں کرنے والی بات محض میرے دل کو خوش کرنے کے لیے کہہ رہی ہو۔“ نازش ہنسی۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ سچ ختم ہے کہ باتیں کرنے کو دل کر رہا تھا ورنہ انفارمیشن تو مونا کو بھی دی جاسکتی تھی۔ اس نے ایک اور جھوٹ بولا حالانکہ مونا کی طرف اس نے صرف اس لیے فون نہیں کیا تھا کہ کہیں سعد فون نہ رسیو کر لے۔“

”میں خوشی سے پھول جاؤں گی۔“ نازش پھر ہنسی۔ ”یہ بتاؤ شام کا پروگرام تو ہے نا؟“

”ہاں۔ وہ تو ہے لیکن ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”نہیں کوئی ایسی گز بڑ نہیں ہے۔ اصل میں میری خالہ نے کل ہی اپنے تمام ساز کے بچوں سمیت ہمارے گھر پر بلد بول دیا ہے۔ اچھے خاصے واہیات بچے پائے ہیں انہوں نے۔“

”پھر؟“

”پھر یہ کہ ڈنکا وعدہ تو ہے لیکن اتنے لوگوں کی موجودگی میں ہم گھر میں ڈھنگ سے کوئی بات نہیں کر سکیں گے۔ میں نے محی سے اجازت لی ہے کہ میں تم دونوں کے ساتھ باہر ڈنر کر لوں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں اور نہ ہی آپ مجھ پر بوجھ نہیں گئے۔“
 ”لیکن بہتر ہوتا کہ آپ بن بلائے یوں نہ چپک پڑتے۔“ مونتا نے نگار کی بات اچکلی۔

”اسے کہتے ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا کہ:

”بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے۔“

ان کا خیال تھا کہ نگار سعد کو روکے گی اور کچھ نہیں تب بھی محض رسماً، لیکن نگار بدستور سر جھکے چکن کارن سوپ چتی رہی۔
 ”قسم سے نگار، میں نے بھائی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔“ مونتا نے سعد کے جانے کے بعد کہا۔

”مجھے پتا ہے۔“ نگار نے اتنی سی بات کہہ کر بات ختم کر دی۔ ”یہ بتاؤ کہ نورین اور فرحان کا کیا رہا؟“

”ان کا کیا ہونا ہے۔ دونوں موقع کی تلاش میں ہیں۔ دونوں میں سے کوئی غلطی کرے اور انہیں بھاتا بنا کر ایک دوسرے سے الگ ہونے کا موقع ملے۔“
 ”بھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسے ہی الگ ہو جائیں۔“ نگار بولی۔

”ایسے کیسے الگ ہو سکتے ہیں بھلا۔“ نازش نے Prawns (جھینگے) اپنی پلیٹ میں ڈالے۔ ”پچھلے سات مہینے سے جگر چلا ہوا ہے اور کوئی بے وفا کی کا اصرام بھی اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔“

”ایسے جھوٹ کا فائدہ؟“ نگار نے تبصرہ کیا۔

”ہر جگہ جھوٹ چلتا ہے کون جھوٹ نہیں بولتا۔“ نازش نے یوں سر ہلاتے ہوئے کہا جیسے کسی دقیق مسئلے کا حل پیش کر رہی ہو۔

”تعلق میں تو جھوٹ کی مجائش کل سکتی ہے لیکن جہاں کوئی واسطہ اور تعلق ہی نہ ہو وہاں کیا جھوٹ بولنا۔“ مونتا نے کہا۔

سعد ان کی میز سے کچھ دور ایک اور میز پر اپنے دوستوں کے ساتھ ذکر رہا تھا۔ نگار کی اس کی جانب پشت تھی لیکن وہ آئینے میں واضح طور پر اسے دیکھ سکتی تھی۔

وہ حالات سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اب اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی گرفت سے نکل رہے ہوں۔ اس میں اسے کوئی شک نہیں تھا کہ وہ خواہ مخواہ منہ اٹھائے وہاں نہیں چلا آیا تھا۔ یقیناً مونتا نے اسے پہلے ہی بتا دیا ہوگا۔ حالات پر اب اس کا بس نہیں رہا تھا۔ اس لیے وہ چپ چاپ سوپ کے پیالے پر جھک گئی۔

”ہیلو گارلر!“ تھوڑی دیر بعد سعد کی آواز اس کی ساعت سے نکرانی۔ ”تم لوگ یہاں کیسے؟“

نگار نے اپنی حرزدہ کر دینے والی نگاہوں سے ایک نظر اسے دیکھا جیسے اس کے جھوٹ پر اسے ملامت کر رہی ہو اور ایک مرتبہ پھر سوپ کے پیالے پر جھک گئی۔ سعد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہم تو یہاں مدعو تھے۔ آپ بن بلائے کیوں تشریف لے آئے؟“ مونتا بولی۔
 ”بعض اوقات انسان بے بس ہو جاتا ہے۔“ وہ کرسی نکال کر انہی کی میز پر بیٹھ گیا۔
 ”کوئی جادو کوئی سحر اسے خود بخود کسی رستے پر لے جاتا ہے۔“

”سعد بھائی! اب آپ شکار چھوڑ کر شاعری شروع کر لیں۔“ مونتا ہنسی۔ ”ویسے اصولاً آپ کو میزبان سے اجازت لے کر یہاں بیٹھنا چاہیے تھا۔“

”میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ اس نے نگار کی طرف دیکھا۔
 ”میرا خیال ہے آپ بیٹھے ہوئے ہیں۔“ نگار نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر نیپکین سے ہاتھ صاف کرنے لگی۔ ”اگر ہمارے ساتھ شریک ہونے آئے ہیں تو میرے کو طلب کیجیے اور آرڈر پلیس (Place) کر دیں۔“

”نہیں، ہم آپ پر بوجھ نہیں نہیں گئے۔ ویسے بھی لگتا ہے آپ کو ہماری آمد کچھ اچھی نہیں لگی۔“

”اس موضوع پر میری معلومات محض کتابی ہیں، اس لیے غلطی کی گنجائش رکھتے ہوئے بات کر رہی ہوں۔“ اس نے نگار کی جانب دیکھا۔ ”تم نے منٹو کو پڑھا ہے؟“

”بس شاید ایک اُدھ افسانہ وہ بھی سرسری سا۔“

”کبھی اسے بطور خاص پڑھو، بہت سے سوالوں کا جواب ملتا ہے۔“ مونا بولی۔ ”اس کے ایک افسانے کا کردار ہے سوگندھی، کوئی اس سے محبت نہیں کرتا لیکن اس سے یہ جھوٹ بولے کہ بھی نہیں کھڑا کہ وہ اس سے پریم کرتا ہے اور وہ ہر بار اس جھوٹ کو سچ سمجھتی ہے۔“

”لوگ اس سے یہ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟“ نگار نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

”اس لیے کہ وہ Prostitute (طوائف) ہے۔“ نگار کو پانی پیتے اچھو لگ گیا۔

”ارے کیا ہوا؟“ نگار نے ایک دم گھبرا گئی۔

”کچھ نہیں، اچھو لگ گیا تھا۔“ اس نے آنکھوں سے بہتا پانی ٹشو پیپر سے صاف کیا۔

”اب سوچو، اس قسم کے تعلق میں بھلا جھوٹ کی کیا گنجائش لیکن پھر بھی جھوٹ چلتا ہے۔“ مونا نے پھر کہا۔ ”مجھے اس افسانے کا ایک فقرہ بہت اچھا لگا۔ منٹو کہتا ہے کہ سوگندھی بھی خوش تھی۔ جسے اصل مونا پسینے کو نہ ملے وہ طبع کیے ہوئے ٹنڈور پر راضی ہو جاتا ہے۔“

نگار نے گہری فطروں سے مونا کو دیکھا، کیا وہ اس کے وجود کی حقیقت، اس کی اصلیت سے واقف ہو گئی تھی لیکن مونا کی آنکھوں میں اس کے لیے وہی اعتبار تھا وہی دوستی تھی۔ وہی سادگی اور وہی شوخی تھی۔ جو اس کی ذات کا حصہ تھی۔ نگار نے سینے میں انکی سانس بالآخر باہر چھوڑ دی۔

”اس کے لیے تو پہلے دیکھنا ہوگا کہ تعلق کسے کہتے ہیں۔“ نگار نے بولی۔

”صاف ظاہر ہے تعلق وہ ہوتا ہے جس میں طبع اور لالچ کو دخل نہ ہو۔“ نگار نے کہا۔

”اور میں نہیں سمجھتی کہ تعلق میں بھی جھوٹ کی کوئی گنجائش ہو۔“

”اور طبع تو صرف تعلقات ہی میں نہیں رشتے ناطے میں بھی موجود ہوتا ہے۔“ نگار نے بولی۔

”رشتوں میں تو یقیناً ہے لالچ۔ تعلقات میں نہیں ہوتا۔“ نگار بھی پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی۔ ”مثلاً میرے اور تمہارے درمیان تعلق ہے لیکن لالچ، طبع اور مفاد سے بے نیاز تعلق۔“

”وہ میرے خیال میں ہر رشتے میں بھی لالچ نہیں ہوتا اور ہر تعلق بھی ضروری نہیں مفاد سے بالاتر ہو۔“ مونا نے صلح کا جھنڈا بلند کرنے کی کوشش کی۔ ”یہ تو درحقیقت روپے پر منحصر ہے۔“

”چلو مان لیا کہ رشتے ناطے اور تعلق میں لالچ ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔“ نگار ہنسی۔ ”تمہاری نورین اور اس کے بوائے فرینڈ کے درمیان کوئی بھی سچا رشتہ یا جائز تعلق نہیں ہے۔ پھر وہ کیوں جھوٹ پر منحصر ہیں۔“

اس کے جائز تعلق کہنے پر مونا نے نگار کی ہلکھلکا کر بنس پڑیں۔

”یعنی ناجائز تعلق ہے۔“ نگار نے ہٹتے ہوئے بولی۔

”کیا ناجائز کیا ناجائز کوئی تعلق نہیں ہے۔“ نگار کو بھی یک دم اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ بھی ہنس دی۔

”اب تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ تعلق ہی نہیں ہے۔“ مونا بولی۔ ”تعلق بہر حال ہے اور تمہاری ہی بات سے اچانک مجھے ہٹا چل گیا ہے کہ ایسے تعلق میں جھوٹ کیوں بولا جاتا ہے۔“

”بتاؤ پھر؟“ نگار نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

”مجھے دینا یہ افسانہ پڑھنے کے لیے۔“

”ضرور۔“ مونا بولی۔

اس کے بعد نگار کا کافی وہاں سے اچاٹ ہو گیا۔ سعد تھوڑی تھوڑی دیر بعد آئینے کے ذریعے اسے دیکھتا رہا لیکن نگار تو غائب دماغی کی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ”بسے اصلی سونا پہننے کو نہ ملے، وہ بیچ کے ہوئے گہنوں پر راضی ہو جاتا ہے۔“ اس کے کانوں میں بار بار سونا کا کہا ہوا فقرہ گونج رہا تھا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ نازش نے توشیش سے پوچھا۔

”ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ پھکی ہنسی بکس دی۔

”کچھ پریشان کر رہی ہو۔“ مونا بولی۔ پھر اس کی نگاہ آئینے پر پڑی۔ ”وہ آئی سی (I see) آئی ایم سوری نگار!“ میں سعد بھائی کو منع کر دوں گی۔ یقین کرو وہ بالکل بھی ایسے نہیں ہیں۔ ممی کب سے ان سے شادی کے لیے اصرار کر رہی تھیں لیکن وہ بالکل بھی انٹرٹینمنٹ تھے لڑکیوں میں۔ ان کے الگ سے اپنے مشاغل ہیں۔ پتا نہیں اب انہیں اچانک کیا ہو گیا ہے۔ تم سے ملنے سے پہلے وہ بالکل ایسے نہیں تھے۔“

”تم کدھر لے گئیں بات کو۔“ نگار مسکرائی۔ پھر اس نے قریب سے گزرتے ہوئے بیرسٹاں لے کر کہا۔

”تم نے سعد بھائی کی باتوں کو مانٹو تو نہیں کیا؟“ مونا نے پوچھا۔

”میں نے منٹو کو تو نہیں پڑھا لیکن چیخوف کو پڑھ رکھا ہے۔ تم ایک جینٹیک کی اتنی مرتبہ معذرت مانگنا چاہتی ہو، انجام لیا ہوگا؟“ نگار ہنسی۔

”مونا اور نازش جی ممی پڑیں۔“

”ہاں خوب معلوم ہے کہ انجام کیا ہوگا۔“ مونا بولی۔

بل دے کر وہ تینوں باہر نکل آئیں۔ سعد بھی ان کے پیچھے ہی باہر آ گیا۔

”مونا، نازش تم دونوں کیسے گھر جاؤ گی؟“ سعد نے پوچھا۔

”اب جب کہ آپ موجود ہیں اور ہم بے کار یعنی بغیر کار کے ہیں تو ظاہر ہے آپ ہی لے جائیں گے۔“ نازش بولی۔

”اور ممی نگار آپ؟“

”میرے پاس اپنی کار ہے۔“

”اتنی رات گئے آپ کو پریشانی تو نہیں ہو گی؟ میرا مطلب ہے، چاہیں تو میں چھوڑ آؤں؟“ سعد نے فراضا نہ پیش کش کی۔

”جی شکریہ۔ ابھی تو صرف نو بجے ہیں، ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔ میں خود چلی جاؤں گی۔“ پھر اس نے دل میں سوچا۔ ”مسٹر سعد آپ کو کیا معلوم میرے نزدیک رات نو بجے دیر نہیں ہوتی۔ اس وقت درحقیقت رات شروع ہوتی ہے۔“

وہ ان تینوں کو باسے کر کے کار میں بیٹھی اور اسے تیزی سے بیک کر کے ایکسپریس پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتی گئی۔

اس کی زندگی آہستہ آہستہ بھنور کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ سعد ایک عام لڑکا ہوتا تو نگار کے لیے اسے بے وقف بنانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

جبکہ اس کا تعلق ہی ایسے پیشے سے تھا جہاں حسن اور اداؤں کی قیمت لگا کرتی تھی۔ مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ مونا کا بھائی تھا اور نگار مونا کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ مونا اور نازش ہی تو تھیں جن کی وجہ سے اس کا تعلق عام اور بے ضرر لوگوں سے قائم تھا۔ قص کی کلاس میں اس کے ساتھ اور بھی لڑکیاں تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ان دونوں جیسی نہیں تھی وہ اس کے حسن سے متاثر تھیں لیکن اپنی Feelings زب کر دیتی تھیں۔ اس کی قص کی صلاحیتوں کی معترف تھیں لیکن اسے داؤد بنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان سب میں صرف مونا اور نازش ہی تھیں جو اس معاملے میں بیخبل نہیں تھیں اور اسی لیے وہ ان کے قریب آگئی تھی۔

اس دن صبح سے ہی گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور سورج نے سارا دن بادلوں کی اوٹ سے شکل نہیں دکھائی تھی فضا خاصی خشک تھی۔ کلاس سے نکلنے تک ایک دم بارش

شروع ہو گئی۔

صبح سے ہی موسم کے تیور خراب تھے۔ نازش نے ہاتھ دستانوں میں گھسائے اونچی مظر سے گردن کو اچھی طرح ڈھک لیا۔

”یہاں سے کار تک جاتے جاتے تو ہم بالکل ہی بھگ جائیں گے۔“ مونانے جیکٹ کے کنارے پر اٹھا دیئے۔

”میں کھڑی رہو گی کیا۔ چلنا تو ہے ناں۔“ نگار بولی۔

”تو بے خطر آتش نمرود میں کود پڑیں؟“ نازش نے کہا۔ ”ہمت جمع کرنی پڑے گی۔“

”یہ آتش نمرود کہاں ہے، یہ تو طوفان نوح لگ رہا ہے۔“ نگار نے موسلا دھار برسی بارش کو دیکھا۔

”پہلا قطرہ کون بنے گا؟“ مونانے ان کی طرف دیکھا۔

”اب تو بہت سے قطرے گر چکے ہیں۔“ نگار نے قدم آگے بڑھایا اور اس کے پیچھے ہی مونانا نازش بھی نکل آئیں۔ تینوں آگے پیچھے بھاگتی کاروں کی طرف بڑھیں۔

ڈرائیور نے اسے آتے دیکھا تو دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ”بی بی کا خراب ہو گئی ہے۔“ اس نے چھوٹے ہی خبر سنائی۔

”کیا؟“ نگار اس اجانک افتادے سے گھبرا گئی۔

”جی گاڑی خراب ہو گئی۔“

”لیکن کیسے؟“

”مجھے کیا معلوم جی۔ صبح سے کھانس رہی تھی۔ اب چانک ہی انکاری ہو گئی ہے۔“

”اچھے ڈرائیور ہوں۔“ نگار کا پارہ چڑھنے لگا تھا۔

”ادھو اب یہاں برسی بارش میں اس سے اُبھتی رہو گی کیا؟“ مونانے اسے اپنے

ساتھ گھسیٹا اور کار کے اندر دھکیل دیا۔ تم نے آج خود کو اور ہمیں ڈبل نمونہ کرانے میں کوئی

کسر نہ چھوڑی تھی۔“ اس نے کار کا ریئر آن کیا۔

”حد ہوتی ہے ناں۔ کار کو بھی خراب ہونا تھا تو ابھی۔“ نگار نے بڑبڑاتے ہوئے نشو پیچہ سے چہرہ پونچھا۔

”اب بتاؤ تمہیں تمہارے گھر چھوڑو؟“ مونانے انکیشن میں چابی گھمائی۔

”نہیں۔“ وہ ایک دم گڑبڑا گئی۔ ”میرا مطلب ہے آج موقع ہے نازش کے گھر چلے چلتے ہیں۔ میں می سے کہہ دوں گی کہ کار خراب ہو گئی تھی اس لیے تم لوگوں کی طرف چلی آئی۔“

”ادھو آئی ایم سوری۔ میرے می ڈیٹی اور بہن بھائی تو گئے ہوئے ہیں کوئٹہ اور میں آج کل مونا کی طرف ہوں۔ ایک دو دن بعد آئیں گے سب۔ پھر تم چاہو تو کسی بھی وقت آ سکتی ہو۔“

”تو پھر مونا کی طرف چلتے ہیں۔“ نگار مرے انداز میں بولی۔

مونانے کار ڈیفنس کی طرف موڑ لی۔

”کپڑے بھیکے ہوئے ہیں اس لیے بیٹر بھی بالکل بے کار ہے۔“ نازش نے دستانے اور مظہر اتار کر سیٹ کی بیک پر رکھ دیئے۔

”میرے تو دانت بچنے لگیں گے تھوڑی دیر میں۔“ نگار نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے مسل کر کچھ گرماش حاصل کرنے کی کوشش کی۔

”بس تھوڑی دیر میں گھر پہنچ جاتے ہیں۔“ مونانے کار کی رفتار بڑھائی۔ ”اب دیکھنا میری کار ایف 16 میں تبدیل ہو رہی ہے۔“

اور واقعی تھوڑی دیر میں وہ مونا کے گھر میں تھے۔ کمرے میں پہنچ کر مونانے وارڈ روپ سے تین ٹیگٹر نکالے۔

”سب سے پہلے ان گیلیے کپڑوں سے نجات حاصل کرنے کی فکر کرو۔“ مونا بولی۔

”جلدی سے دو، میں تو سردی سے مر جاؤں گی ورنہ۔“ نازش نے ہنسنے پر آمنا کیا۔

”تم دونوں فی الحال یہاں آرام کرو۔ پہلے میں کپڑے تبدیل کر لوں۔“ نگار ایک بیگر کھینچ کر ہاتھ روم کی طرف بھاگی۔ ڈار کو کافی تھنڈک چکی تھی اور گرم گرم بلیک کافی پیتے ہوئے بھی وہ مسلسل چیخند رہی تھی۔

”اللہ کی بندی یہ تمہاری پشت پر پڑی لمبی سی بل کھاتی ہوئی چوٹی بھی جھجک چکی ہے۔ بخار ہو جائے گا تمہیں اس طرح۔“ نازش بولی۔

”اب کیا کروں۔ یہ آتی جلدی خشک ہونے والے نہیں ہیں۔“

”یہ لو،“ مونا نے دراز سے ہیر ڈرائر (Hair Drier) نکال کر دیا۔

اس نے جلدی جلدی اپنے بال چھپا کی قید سے آزاد کیے۔

”اسے کہتے ہیں پشت پر سٹیلے مگر آگ لگاتے گیسو۔“ نازش ہنسی۔

”بالکل غلط۔ آگ اور پانی کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔“ نگار بال خشک کرتے ہوئے

بولی۔

”الو خود دیکھ لو تمہاری پشت پر آگ اور پانی اکٹھے ہو گئے ہیں۔“

وہ تینوں ہنس پڑیں۔

”ہاں یا دادیائے“ مونا اپنے بک شلیف کی طرف بڑھی۔ ”یہ کتاب تمہیں دینا میں

بالکل بھول جاتی ہوں۔ روزانہ یاد کرتی تھی اور جاتے جاتے ذہن سے نکل جاتا تھا۔ اسی

میں وہ افسانہ ہے جس کا میں نے اس دن ذکر کیا تھا۔“

”کیا نام ہے افسانے کا؟“ نگار نے کتاب الٹ پلٹ کی۔

”ہنک۔“ مونا نے بتایا۔ ”اس کا نام ہنک ہے لیکن اس میں اس کے علاوہ بھی بہت

سے اچھے افسانے ہیں۔“

کچھ دیر بعد نازش کی مٹی کا کونڈ سے فون آگیا اور وہ فون انشید کرنے کمرے سے

باہر چلی گئی۔ اس کے پیچھے مونا بھی کافی کے برتن اٹھا کر نکل گئی۔ نگار نے وقت گزاری کے

لیے کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی۔ ابھی مونا کو نکلے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کمرے کے

دراز سے پرتک ہوئی۔

”مونا ہوگی۔“ اس نے دل میں سوچا اور پھر باز بندلیس (yes) کہا۔

”اندر آنے والا مونا نہیں بلکہ سعد تھا۔ نگار نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اس کے

قریب ہی کٹن پر بیٹھ گیا۔

”نگار! مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا تھی۔“ سعد نے کہا۔

”کیجیے۔“ نگار نے خود کو سعد کی متوقع بات کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا۔

”میں کبھی کسی لڑکی سے متاثر نہیں ہوا تھا حالانکہ میں بہت سی حسین اور ذہین لڑکیوں

سے ملا ہوں لیکن میں نے کبھی کسی پر توجہ نہیں دی تھی۔“ سعد کہہ رہا تھا۔ ”لیکن معلوم نہیں

کیوں تمہیں دیکھتے ہی جیسے میں اپنے آپ میں نہیں رہا۔ تم میں صرف حسن و خوبصورتی ہی

نہیں ہے۔ ایک اسرار ہے۔ ایک حیر ہے میں اس اسرار کا کھوج لگانا چاہتا ہوں۔ اس حیر

سے خود کو آزاد کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری زندگی میں آ جاؤ تاکہ۔۔۔“

سعد نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ نگار کو اس کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی لگ رہی تھی۔

یوں جیسے وہ کسی گھر سے کنویر سے بول رہا ہو۔

”نہیں، میں سوگندھی نہیں ہوں۔“ اس نے سوچا۔ ”سوگندھی طمع کیے ہوئے گہنوں پر

راضی ہو سکتی تھی لیکن میں اس قدر راقی نہیں ہوں۔ ہمارے درمیان تو سرے سے کوئی تعلق

ہی موجود نہیں ہے۔ پھر اس کی پریم کہانی میں خود کو الجھانے کا فائدہ؟ ابھی اسے میری

اصلیت معلوم ہو جائے تو ساری عشق و عاشقی ہوا ہو جائے۔“

وہ ہلے سے ہنس پڑی۔ سعد والہانہ انداز میں اسے نکتے لگا۔

”آپ پتا نہیں کس دنیا کی کہانی سنا رہے ہیں مجھے۔“ نگار نے سوچ لیا تھا کہ اسے

کیا کہنا ہے۔ ”میں نے آپ کو کسی حیر میں گرفتار نہیں کیا۔ رو گئی آپ کی زندگی میں شامل

ہونے والی بات تو یہ بھی ممکن نہیں۔“

”کیوں ممکن نہیں؟“ وہ تیزی سے بولا۔

واپسی پر دروازے سے تیزی سے نکلتے ہوئے وہ دوسری طرف سے آتے سعد اور اس کے دوست سے ٹکراتے ٹکراتے چلی۔

”سوری۔“ سعد ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

اس کے دوست نے پر خیال نظروں سے نگار کی جانب دیکھا۔

”It's Al right“ کہہ کر نگار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

نگار کے ذہن میں سعد کے دوست کی نگاہیں گویا چپک کر رہ گئیں اس کی آنکھیں نگار سے کچھ کہہ رہی تھیں لیکن وہ توجہ دیے بغیر چلی آئی تھی۔

☆=====☆=====☆

”اس لیے کہ قلعہ آپ سے پہلے کوئی اور فتح کر چکا ہے۔“

”کیا؟“ سعد کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”جی۔ میں انگلیز ہوں۔“

سعد چند لمحوں کے بعد اعتباری سے اسے متکنا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”آئی ایم سوری۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔“

وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ نگار نے ایک گہری سانس لی۔

”چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا۔“ اس نے سوچا۔

تھوڑی دیر بعد موٹا اور نازش ہنستی کھلکھلائی کمرے میں داخل ہوئیں۔

”سوری، تم اسکیلے میں بہت بور ہوئی ہوگی۔“ موتا نے معذرت کی۔

”نہیں بوریت کیسی۔“ وہ بولی۔ ”لیکن اب مئی کو فون کرنا ہے۔ ورنہ وہ پریشان ہو جائیں گی اور ہر طرف تلاش گمشدہ کا اشتہار لگ جائے گا۔“

”مظہرو۔ میں نہیں فون لے آتی ہوں۔“ موتا اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تمہارے گھر فون لگ گیا ہے؟“ نازش نے نیل پالش کھرچتے ہوئے پوچھا۔

نگار کو خیال آیا کہ اس نے انہیں اپنا نمبر نہیں دیا ہوا۔ ”نہیں، مئی آنٹی کی طرف گئی

ہوئی ہیں وہیں انہیں بتا دوں گی۔“

”موتا فون لے آئی۔ نگار نے نمبر ڈائل کیا۔ فون زر قانے اٹھایا۔

”ہیلو زر قانمی ہیں؟“

”ہاں کہو تو بلا لاؤں۔“

”نہیں رہنے دو۔ میں نے بتانا تھا کہ واپسی پر گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے میں

موتا کے ساتھ اس کی طرف آ گئی ہوں۔“

”ہاں ڈرائیور نے بتا دیا تھا کہ وہ کار ٹھیک کر رہا ہے بھیج دوں اسے؟“

”ہاں پلیز۔“

اپنی قدر و قیمت معلوم نہیں ہے لیکن چھوڑ آہستہ آہستہ سب پتا چل جائے گا۔ مردوں کو آلو پیاز پھینکتی بیویاں اور ریں ریں کرتے بچے اتنے اچھے لگتے تو کاہے کو کوئی یہاں کا رخ کرتا۔ یہاں ان کی بیویاں نہیں ہوتیں جو دفتر سے شوہر کے آتے ہی ساس نندوں کے جھگڑوں کی کھٹا اسے سنانے بیٹھ جائیں۔ کبھی کسی کے سر میں درد ہے کبھی ٹانگ میں اور شوہر بے چارہ ڈاکٹر کے پاس بھی مارا ماری کرے۔ یہاں لوگ اپنے غم بھلانے آتے ہیں وہ غم جو انہیں ان کے گھر سے ان کے بنائے ہوئے معاشرے سے ملنے ہیں۔

”اماں! وہ تو یہاں اپنے غم دھو جاتے ہیں۔ ہم اپنے غم دھونے کہاں جائیں؟“ نگار نے مدھم تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ہر چیز کے حصول کے لیے قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ مرد اپنے غم یہاں پھینکتے ہیں، خوشیاں وصول کرتے ہیں پیرسہ کرے، ہم ان کے غم سمیٹتے ہیں، انہیں خوشیاں فراہم کرتے ہیں پیرسہ لے کر۔ یہ تو لین دین کا بنیادی اصول ہے۔ پیرسہ ہر غم دھو ڈالتا ہے۔ وہ پیرسہ لٹاتے نہیں تھکتے تو ہم سمیٹ کر کیوں تھکیں، ویسے بھی ہماری کمائی کب تک چلتی ہے۔ اچھا ہے دکان بڑھانے سے پہلے جتنا کچھ سمیٹ سکتے ہیں سمیٹ لیں۔“

”اماں! وہ انجم ہے ناں۔ سنا ہے وہ اکبری منڈی والے کے ساتھ بھاگنے کے پتھر میں ہے۔“ پائل نے لپ اسٹک لگاتے ہوئے کہا۔

”حد ہے۔ تو بے توبہ۔“ زمر بائی نے کلوں کو ہاتھ لگائے۔ ”ایک ہی ایک کمانے والی ہے اس لیے خسرے کرتی ہے۔ وہ لے بھی گیا تو واپس یہیں پھینک جائے گا مینے دو مینے میں۔ مفت میں ملے تو بھلا اسے کیا کرے؟“

”اماں! کون سی انجم؟“ نگار نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ار۔ اپنی بچہ۔“

”اچھا بچہ۔“ نگار اور اس کے کمرے کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ کبھی جو نگار تاروں کی چھاؤں اور خوشنوی ہاؤس باہر نکلتی تو اسے سب آوازیں بخوبی سنائی دیتیں۔

”کیسی ہیں تمہاری سہیلیاں؟“ اماں نے اس سے پوچھا۔

”انہیں کیا ہوتا ہے اماں۔ ٹھیک ہیں۔“ نگار کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی بیزاری بھٹک آئی۔

”تم اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں رہنے لگی ہو گڑیا۔“ کا جل نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”نہیں تو ایسا تو نہیں ہے۔“

”تھک جاتی ہوگی۔“ پائل بولی۔ ”اماں پر بھی تو بھوت سوار ہے اسے ہواؤں میں اڑانے کا۔ یہ نہیں دیکھتیں کہ اتنی اڑان یہ لے بھی سکتی ہے ہانپیں۔“

”لڑکیو تمہاری اماں پاگل نہیں ہوئی۔ جدی پشتی، کاروباری لوگ ہیں، کوئی کل نہیں آ کے شیخے اس کاروباری دھندے میں۔“ زمر بائی چلائیں۔ ”میں جانتی ہوں، یہ کیا کر سکتی ہے۔ ارے یہ لڑکی تو سلطنتیں داؤ پر لگوا سکتی ہے۔“

”اماں رہنے دیں۔“ نگار وہیں تخت پر بیٹھ گئی۔ ”ایک طوائف کے پیچھے کوئی سلطنتیں داؤ پر نہیں لگایا کرتا۔“

”پائل لڑکی! ایک عام چولہا ہانڈی کرنے والی عورت کے پیچھے کبھی کسی کو کتنے مرتے دیکھا ہے؟“

”بادشاہتیں یا تو شہزادوں پر داؤ پر لگا کرتی ہیں یا طوائفوں کے پیچھے۔ تجھے خود بھی

آنے والے کل میں میرے پاس کچھ نہیں ہوگا سوائے اپنے خالی دامن کے اور چند یادوں کے۔ آج جو لوگ میری آنکھوں کی روشنی دیکھ کر سحر زدہ رہ جاتے ہیں کل جب یہ روشنی تمک کر گل ہونے کے لیے ٹھمکنے لگے گی تو کوئی اس کے سحر میں قید نہیں ہوگا۔ آج جو لوگ میرے لیے سنہری بالوں کی زنجیر میں جکڑے جا رہے ہیں کل ان بالوں میں جب سفیدی اتر آئے گی تو کیا ہوگا؟ پھر لوگ مجھے بھی اسی طرح اونہ کر کے چلتے بنیں گے۔ جیسے سوگندھی کے ساتھ ہوا تھا۔ جھوٹے اور ملع کیے ہوئے گہنے بھی جھین لینے کے لیے۔

اس نے اپنے لمبے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں سمیٹ لیا۔ کتنی دیر تک وہ ایسے ہی بیٹھی رہی لیکن پھر اسے ایسے لگا کہ سارا کمرہ سوگندھی کی جھک سے بھر گیا ہے۔ ہر طرف سے ”اونہ“ کی صدا نہیں آ رہی ہیں۔ اسے یوں لگا جیسے سوگندھی نہیں وہ رد کی جا رہی ہو۔ اور ایک بار نہیں بار بار رد کی جا رہی ہو۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے رضائی ایک طرف پھینکی اور کمرے سے باہر خنکی میں نکل آئی۔ کھلی ہوا میں چند گھرے سانس لیے اور جھنگ کا سہارا لے کر آسمان کو تنکے لگی جہاں بادلوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں روشن اور شفاف ستارے بھی دکھائی دے رہے تھے لیکن چاند بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ تھوڑے جواس درست ہوئے تو اسے نوجو کے کمرے سے ملکی ملکی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ موسے کی مہک طبلے کی تھا پ اور گھنگھروؤں کی جھکار کے پس منظر میں اسے یہ ابھرتی سسکیاں بہت پر اسرار لگیں۔ وہ جھنگ پر بٹجھ اور سرک کر نوجو کے چوبارے کے قریب ہو گئی۔ ”یہاں تو ہمیشہ گھنگھرو بولتے تھے۔ مدھم مدھم سرگوشیاں ہوتی تھیں، دہلی دہلی ہنسی ابھرتی تھی۔ پھر آج یہ سسکیاں تھیں۔“ اس نے سوچا۔

”یہ آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔“ سسکیوں کے درمیان نوجو کی آواز ابھری۔ تمہارے لیے تو میں ہر ایک سے ٹکرائی ہوں اور جب میں نے ساری کشتیاں جلا دی ہیں تو تم کہہ رہے ہو کہ تم اس کے لیے تیار نہیں ہو۔“

نگار منتظر تھی اس اکبری منڈی کے بیوہ پارے کا جواب سننے کے لیے۔

”ہاں کوئی آتا تو ہے وہاں۔“ نگار منس پڑی۔ ”ذرا باہر نگلوں تو سب سنائی دیتا ہے۔ لیکن میں بہت اچھی لڑکی ہوں منعی نہیں ہوں کچھ۔“

”لو سارے بازار میں چوچا ہے اس کا۔“ زرق کہنا۔ ”بیوہ پارے ہے۔ پڑھا لکھا زیادہ نہیں ہے۔ پر بہت پیسہ ہے اس کے پاس۔“

”اچھا لڑکیو، اب دیر نہ کرو۔ جلدی جلدی تیار ہو جاؤ! زمر دہائی نے عادت کے مطابق انہیں حکم دیا۔“ استاد جی، پیارے خان آپ دونوں بھی تیار ہو جائیں۔“

”ہائی جی ہم تو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ آپ بس حکم کریں۔“

نگار اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر تک وہ اپنی انگریزی کی کتاب پڑھ کر نوٹس بناتی رہی۔ جب تھک گئی تو کتاب کا پی میز پر پھینک کر بیگ سے مونا کی دی ہوئی کتاب نکالی اور رستہ میں کھس گئی۔

نگار نے جب تک افسانہ پڑھنا شروع کیا۔ افسانہ دلچسپ تھا لیکن صرف ان کے لیے جن کا تعلق اس ماحول سے نہیں تھا۔ نگار کے لیے وہ قطعاً دلچسپ نہیں تھا۔ اس کے لیے وہ بے حد ناگوار تھا لیکن وہ پڑھتی تھی۔ اس حقیقت کی تلاش میں کہ جہاں کوئی تعلق، کوئی ناتانہ ہو، وہاں لوگ جھوٹ کیوں بولتے ہیں۔ افسانہ پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے کے عضلات کھینچنے لگے۔ ہونٹ کھینچ گئے، مشکلوں سے افسانہ ختم کیا اور کتاب دروازے پر دے ماری۔

”بکواس، زنا جھوٹ، زہریش۔“ وہ چلائی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ نہ یہ سب بکواس ہے نہ جھوٹ اور نہ زہریش۔ ”کوئی سوگندھی کی جھک کیوں کرے؟ کسے حق پہنچتا ہے اس کا؟ یہ لوگ اپنے گریبانوں میں کیوں نہیں جھانکتے۔ یہ کیوں سا سوگندھی سے بہتر ہیں کہ اسے زد کر کے چلتے بنیں۔“ لیکن اس کی آواز اس کے جھوٹے کمرے میں ہی گونج کر رہ گئی۔ اس نے چشم تصور سے وہ وقت دیکھا جب وہ بالکل تنہا ہوگی۔ جب اس کا دور ختم ہو جائے گا۔ آج اماں سے لوگ میری تصویر دیکھ کر پوچھتے ہیں کہ اس میرے کو کہاں چھپا رکھا ہے لیکن

”تم تو اسحق ہو، تمہارا کیا خیال تھا کہ میں تمہیں بھگا لے جاؤں گا۔“ مرد کے لہجے میں تندی تھیں۔

”تو وہ کیا تھا؟“ نجو چیخ پڑی۔ ”وہ تمہاری پریم کہاں لیا، وہ کتنا نہیں بونم بٹھے سنایا کرتے تھے، وہ امیدیں جو تم نے مجھے دلائی تھیں، کیوں جھوٹ بولا تم نے؟ کیوں؟ کیوں؟ مجھے تم نے کتنے کانٹیں چھوڑا کیوں کیا تم نے ایسا؟“

”بھئی کیا پتا، تھی کسی کہ میں تجھے اپنے گھر لے جاؤں۔“ غالباً اس نے نجو دھوکا دیا تھا۔ ”وہاں میرے بیوی بیٹے ہیں۔ ان کے پاس لے جاتا تھے۔ اپنا گھر برباد کرتا تیرے واسطے، روپے پیسے کے بدلے بکتے والی بازاری عورت۔“ مرد کے لہجے میں کٹ تھی، نشتر تھے جس سے وہ روح کو چر رہا تھا۔ ”تجھے اپنی بیوی پر سوکنا بنانا؟“

نگار کے دماغ پر جیسے کوئی ہتھوڑے برس رہا تھا۔ کسی نے اس کا سارا جسم سن کر کے رکھ دیا تھا۔ ہر طرف سے صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

”جیہوں کے بدلے بکتے والی عورت۔“

ہر چیز قہقہے لگا رہی تھی۔ سو گندھی اور نجو کی ہنک پر۔ خود نگار کی ہنک پر۔ آسمان ہنس رہا تھا۔ ستارے اس کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ ان کی فہمی سن کر چاند بھی بادلوں کی اوٹ سے نکل کر اسے استہزائیہ انداز میں گھور رہا تھا۔ زمین اس کے پاؤں تلے سے کھسک رہی تھی۔ وہ اندھا دھند اندر بھاگی۔ کانپتے ہاتھوں سے ابھی اس نے دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ تیرم کا تیرک گہرائی میں کسی نے اسے پکارا۔

”نگار۔“

کسی جانی پہچانی آواز نے بہت واضح طور پر اس کا نام لیا تھا۔ وہ رک گئی۔ وحشت زدہ نگاہوں سے اس نے مڑ کر دیکھا۔

”تم ہر روپ میں غضب ڈھاتی ہو۔ جاتی ہو جب شکار کی ہرن شکار کرنے لگتا ہے تو اس خوفزدہ ہرن کی آنکھیں کیسی ہوتی ہیں۔ بالکل ویسی جیسی اس وقت تمہاری ہیں۔“

نگار وہیں کھڑی کھڑی رہ گئی۔ دروازے کے پینڈل پر مضبوطی سے جھے۔ وہ اس کے ہاتھ کی گرفت ایک دم کمرور پڑ گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سعدو بااں سکتا ہے۔ یہاں اس کے کمرے کے پاس جہاں آج تک کوئی مرد نہیں آیا تھا۔

”آپ؟“ اس کے منہ سے صرف اس قدر نکل سکا۔

”ہاں میں۔“ میری آمد کچھ ایسا انوکھا واقعہ بھی نہیں ہے۔ ”وہ ایک ہاتھ دیوار پر لگتا ہوا بولا۔ ”یہاں تک تو میرے علاوہ بھی نہ جانے کتنے آئے ہوں گے۔“

نگار نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن سارے الفاظ نہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ دور دور تک جیسے مہیب خلا تھا جس میں بربند پاؤں چلتی جا رہی تھی لیکن اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”میں تو تمہیں ایک معزز اور باوقار بندھن میں باندھنے کی بات کر رہا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہیں بندھنوں میں نہیں باندھا جا سکتا کیونکہ گھر کی چار دیواری تمہارے قبیل کے لیے بنی ہی نہیں ہے۔ یہ قلعہ تو کوئی بھی فتح کر سکتا ہے چند نگوں کے غرض۔“ سعد کے ہونٹ تسخیر سے سکڑ گئے۔ ”میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں، ہر حال میں بتاؤ سستے سکوں کے عوض تم میرے پہلو میں آ سکتی ہو۔“

نگار کی قوت پر داشت جواب دے چکی تھی۔ ہنک، ہنک، ہنک سو گندھی کی ہنک۔ نجو کی ہنک اور اب نگار کی ہنک۔ زمین سرک رہی تھی۔ آسمان قہقہے لگا رہا تھا۔ ایک ایک چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔

”جیہوں کے بدلے بکتے والی عورت۔“

ہر چیز نگار کی نگاہوں کے سامنے گردش کر رہی تھی۔ چھت چکر کھا رہی تھی۔ کھڑکیاں زور زور سے بج رہی تھیں۔ اوپر گلاب پوری توت سے مل رہا تھا۔ نگار نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ اس طوفان سے ٹکنا چاہتی تھی۔ اس بھنور میں گھومتے گھومتے اس نے بھی جھٹکے کا سہارا تلاش کر لیا۔

”بات تو آپ سے کرنی تھی۔“ زین کے لہجے میں خوشی تھی۔

”جی؟“ تمکین کو ہرگز اس بات کی توقع نہیں تھی۔

”کیوں، آپ نہیں کرنا چاہتیں بات؟“ شاید وہ اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہو رہا

تھا۔

تمکین کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس کی بات کا کیا جواب دے۔ بات وہ اس سے کر نہیں سکتی تھی لیکن انکار کرنے سے اس کے نفٹا ہونے کا اندیشہ تھا۔ پتا نہیں کیسا مزاج ہے اس کا کہیں وہ بھی اس پر سڑے ہونے کا لیبیل نہ لگا دے۔ وہ اسی شش و پنج میں تھی کہ زین بول اٹھا۔

”بھئی امی بات کرنا چاہتی ہیں آپ سے۔ نہیں کرنی بات تو فون بند کر دوں کیا؟“

تمکین ایک دم ہنس پڑی۔ ”کرا دیں بات۔“

”کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس وقت میں آپ کو دیکھ سکتا۔ ہنستی اچھی لگتی ہیں۔“

”میں فون بند کر رہی ہوں۔“ اس نے ہونٹ کاٹ کر بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔

”ارے نہیں۔ آپ بات کریں امی سے۔“ پھر وہ امی کو آوازیں دینے لگا۔ ”امی!

آئیں بات کر لیں اپنی ہونے والی ہوسے۔“

دوسری طرف تمکین اس کی بات سن کر مسکرا دی۔ تھوڑی دیر بعد، سیویرائیڈ کی آئی

نے تمام لیا۔ کچھ دیر سلام دعا کرنے کے بعد وہ پولیس۔

”کب چل رہی ہو زین خریدنے؟“

”آئی! جب آپ کہیں۔“

”تو چلوکل چلتے ہیں۔ زین بھی فارغ ہے، لے چلے گا۔“

”جی!“ اسے دھچکا لگا۔ آئی ایک حد تک روشن خیال تھیں لیکن اس کی امی شاید یہ

کبھی پسند نہ کرتیں۔ پر اس بات کا اظہار وہ ندا کے سامنے تو کرسکتی تھی۔ آئی کے سامنے

نہیں۔ ”جی آئی۔“

”اماں!“ رہ پوری توت سے جیتی اور چیختی چلی گئی۔ بھاگتے قدموں کی آواز آئی اور

وہ وہیں دروازے کے پاس ڈھیر ہو گئی۔

☆=====☆=====☆

تمکین کی تمکین کے بعد امی نے زور و شور سے اس کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ویسے تو تقریباً سبھی کچھ بنا ہوا تھا لیکن پھر بھی چھوٹے چھوٹے نہ جانے کتنے کام نکھرے ہوئے تھے۔ دوسری طرف زین کی امی نے اسے بتا دیا تھا کہ بڑی امی کی پسند سے بیٹے گی۔

”پسینے والی تم ہو۔ تمہیں ہی کچھ پسند نہ آیا تو کیا فائدہ؟ پسے بھی خرچ ہوں اور زیور کپڑا تن سے بھی نہ لگے تو کیا فائدہ۔“ انہوں نے کہا۔

تمکین کو ان کی یہ بات اچھی لگی تھی۔

”ہر کوئی تمہاری ساس کی طرح سوچنے لگے تو دنیا ہی بدل جائے۔“ صوفیہ کو پتا چلا تو اس نے تبصرہ کیا۔ ”کاش میری ہونے والی ساس بھی ایسی ہی اچھی ہوتی لیکن تو بہ کرو۔ ہمارے گھر آ کر تو وہ مجھے اچھے بیٹھے ایسے گھورتی ہے کہ سانس حلق میں انک جاتا ہے۔ صبح ہونے والے کام بھی ضرور غلط ہوتے ہیں۔ کبھی بیانی ہاتھ سے پھسلتی ہے اور کبھی گلاس پھینکا پڑھتا ہوتا ہے۔ اوپر سے امی کی ڈانٹیں الگ سنو کہ سرسرا، جانے سے پہلے یہ لڑکی گھر کا کچا تنکا تک ڈسٹ بن کر نذر کر کے جائے گی۔“

اس وقت تمکین پینک پرنٹھی اپنے دوپٹے پر کرن لگا رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سیویرائیڈ لیا۔

”ہیلو۔“

”زین بول رہا ہوں۔“

تمکین کے چہرے پر سرخ فہمیل گئی۔ وہ چپ ہو گئی پھر بولی۔ ”ابو اور امی گھر پر نہیں

ہیں۔“

”اور تم ابھی کیا کر رہی تھیں؟“

”کرن لگاری تھی دوپے کو۔“ اس نے بتایا۔ ”مدا گھر ہے؟“

”ہاں۔ بات کرنی ہے؟“

”جی کرادیں پلیز۔“

”کہاں گم رہتی ہو۔“ ندانے آتے ہی شکوہ شروع کر دیا۔ ”میں ہی فون کروں تو

کروں۔ تم تو پوچھتی ہی نہیں ہو بالکل۔“

”اتنا شکوہ، تمکین ہنس پڑی۔ ”بھلا یہ اچھا لگے گا کہ میں روز روز سسرال فون کر

رہی ہوں۔ یہ جو ڈھائی بال ہیں میرے سر پر، یہ بھی امی نہ رہنے دیں۔“

ندابھی ہنس دی۔ ”تو امی کے ڈر سے ترسار ہی ہو میرے بھائی کو۔ پتا ہے تمہاری

منگنی کے دن والی تصویریں اتنی بڑی کر کے لگائی ہیں انہوں نے گھر میں ہر طرف۔“

”سچ؟“ تمکین حیران تھی۔

”تو اور کیا۔ میں اور امی تو ان کا پاگل پن دیکھ کر ہنستے ہیں۔ انہیں تو تمکینیز یا جو گیا

ہے۔“ ندا بولی۔ ”اور پتا ہے ابھی میں فون ملانے لگی تھی تو میرے ہاتھ سے ریسیور لے لیا

کہ میں خود ملاؤں گا اور پھر ابھی مجھے ہنستے ہوئے بتا رہے تھے تمہاری بوکھا ہٹ کے بارے

میں۔“

”ترسے میں تو پریشان ہو گئی تھی اور ہاں۔“ اسے اچانک یاد آگیا۔ ”آئی کہہ رہی

تھیں کہ کل وہ فارغ ہوں گے تو وہی شاپنگ پر لے جائیں گے۔“

”ہاں۔ کیوں؟“

”امی کبھی اجازت نہیں دے گی۔“ تمکین نے بے چارگی سے کہا۔

”میں لے لوں گی اجازت۔ پھر امی بھی ساتھ ہوں گی مسئلہ یہ ہے کہ گھر والا ڈرائیور

چھٹی پر ہے اور زین بھائی کو اس پر بہت اعتماد ہے۔ آفس والے ڈرائیور کو وہ گھر کی ذمہ

داری نہیں دیتے۔ اس لیے ظاہر ہے ڈرائیور تک تو زین بھائی کو ہی کرنی پڑے گی کیونکہ مجھے

تو آتی نہیں۔“

”مجھے پتا ہے، امی نہیں مانیں گی۔“

”کیسے نہیں مانیں گی۔ ایک تو سفارش اتنی گھڑی ہو گی اور پھر تمہاری پسند کے بغیر

بڑی کیسے بنے گی؟“

”امی نے کہا ہے کہ میری پسند کی ضرورت نہیں ہے۔“

”یہ تو اچھی خاصی گڑبڑ ہے لیکن خیر یہ مجھ پر چھوڑو، سنبھال لوں گی میں۔“

”تم تو وقتی طور پر سنبھال کر گھر چلی جاؤ گی۔ میں نے ابھی مزید کچھ عرصے یہاں

رہنا ہے۔“

”تم فکر ہی نہ کرو۔ میں کچا کام کرنے کی عادی نہیں ہوں۔“

فون رکھ کر تمکین دوبارہ دوپے میں کرن ٹانگنے لگی۔

”امی کو بتا دوں انہیں۔“ وہ سوچ رہی تھی۔ ”یہ تو خیر بتانا ہی ہوگا کہ آئی کا فون آیا

تھا لیکن یہ بتانا مشکل ہوگا کہ شاپنگ پر وہ لے جائیں گے۔ امی نے تو اسی وقت حکم صادر

کر دیتا ہے کہ بے شک سردرد کا بہانا بنانا پڑے تم نے نہیں جانا ہے پر مسئلہ یہ ہے کہ میں

امی سے کچھ چھپا بھی تو نہیں سکتی۔ مجبوری ہے۔ بتانا ہی پڑے گا۔“

لیکن اس وقت اسے حیرت کا شدید جھوکا لگا جب اس نے مناسب کاٹ چھانٹ

کے ساتھ انہیں آئی کے فون کے متعلق بتایا تو انہوں نے کہا۔

”میں تمہارے ابو سے بات کرتی ہوں۔ وہ اجازت دیں تو چلی جاتا۔“

وہ ابو کی عدالت کے فیصلے کی منتظر تھی۔ اتنی زیادہ اجازت نہ سمیٹہ آپا کو ملی تھی اور نہ

اسما کو اور یہاں تو زین کے گھر والے پہلے ہی بہت لبرٹی لے جا چکے تھے ورنہ ان کے

خاندان میں تو کبھی بھی منگنی کی اگلی خود لڑنے کے لڑکی کو نہیں پہناتی تھی۔ امی ابو نے اس

کی اجازت اس لیے دی تھی کہ تمکین انہیں اپنے بچوں میں سے زیادہ پیاری تھی لیکن

اپنے منگیتر کے ساتھ باہر نکلنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا ہوتا تھا۔ پورے خاندان میں اس کی

”دیکھو اگر ابوجا زت نہیں دیں گے تو ہو سکتا ہے وہ خفا ہو جائیں اور اگر دے دیں گے تو اس کے لیے ابوجا اپنا ایک اصول تو بنا پڑے گا۔ یہ دونوں باتیں بن غلط ہوں گی۔“

”یہ بتائیں آپ کیا چاہتی ہیں؟“

”اول تو میں یہ چاہتی تھی کہ اس قسم کی صورت حال پیدا نہ ہو۔“

”یعنی یہ کہ ان کا ڈرائیور چھٹی پر نہ جائے۔“ منو بولا۔ ”اور اب جب کہ ایسا ہو گیا ہے تو پھر؟“

میرے چاہنے نہ چاہنے کی بات نہیں ہے۔“

”میں تو غلط بات ہے۔“ منو نے اتھم میں پکڑی پنسل کو زور زور سے فضا میں لہرایا۔ ”زندگی آپ کی ہے، اس پر کم از کم اتنا اختیار تو اپنا رکھیں کہ اس کے مختلف پہلوؤں پر سوچ سکیں اس پر ایک رائے رکھ سکیں۔ ہر فیصلے کے لیے امید بھری نگاہوں سے اپنے بڑوں کی جانب کیوں دیکھتی ہیں آپ؟ ایک طرف آپ کو یہ فکر ہے کہ آپ کے وہ خفا نہ ہو جائیں۔ دوسری جانب آپ کو ابو کے اصول نوٹنے کا اندیشہ ہے۔ کمال ہے۔“

”تم لڑکی نہیں ہو، اس لیے لڑکیوں کے مسائل نہیں سمجھ سکتے۔“

”ان خود ساختہ مسائل کو میں کیا اسطو اور الفاظوں بھی نہ سمجھ سکتے اگر آج وہ یہاں ہوتے۔“ منو بولا۔ ”اور یہ بھی یاد رکھیں کہ اصول انسانوں کی سہولت کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ انسان اصولوں کی سمجھت چڑھنے کے لیے نہیں بنائے گئے اور یہ بھی یاد رکھیں کہ اگر آپ جانا چاہتی ہیں تو ساری جھجک ختم کر کے چلی جائیں اور نہیں جانا چاہتیں تو دو ٹوک الفاظ میں منع کر دیں۔ اتنی سی بات پر اگر کوئی غصہ خفا ہوتا ہے تو ایسے شخص کی پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”تمہاری منطق دنیا جہان سے نرمی ہے۔“ تمکین کا موڈ آف ہو گیا۔

”بھو! میں غلط نہیں کہہ رہی۔ کوئی رائے تو آپ کی اپنی بھی ہونی چاہیے۔“

”تو یہ ہے، تم سے تو بات کر کے ہی میں پھنس جاتی ہوں۔ چلو کتاب کھولو اپنی۔“

مثال نہیں ملتی تھی۔

”آپ کس پریشانی میں مبتلا ہیں بچہ۔“ اس کے کمرے میں بیٹھ کر پڑھتے ہوئے منو

نے اسے منہ لٹکائے دیکھا تو پوچھا۔

”تم یہ پریشانی حل نہیں کر سکتے اس لیے چپ چاپ کتاب میں سرگھسا دو۔“

”وہ شاعر نے میرے لیے ہی کہا ہے کہ۔“

خنجر چلے کسی پہ ترپتے ہیں ہم امیر

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اس لیے جب تک آپ منہ لٹکائے بیٹھی رہیں گی تب تک میں پڑھ نہیں سکوں گا۔“

”تمہارے مطلب کی بات نہیں ہے۔“

”تو پھر باب یا صوفی سے مشورہ لے لیں۔“ منو نے مشورہ دیا۔

”اس سلسلے میں وہ بھی کچھ نہیں کر سکتیں۔“

”تو پھر کون یہ مسئلہ حل کر سکتا ہے؟“

”صرف ابوجی لیکن نہیں مسئلہ تو ہیں کھڑا رہے گا پھر بھی۔“

”اوہو، پھر تو واقعی بہت گھمبیر مسئلہ ہوگا۔ مجھے بتائیں شاید میں حل کر سکوں اور اگر

حل نہ کر سکوں تب بھی مجھ سے کہہ سکیں کہ کم از کم آپ کے دل کا بو جھوٹا بکا ہو جائے گا۔“

”سوچنے دو تمہیں بتاؤں یا نہیں۔“ تمکین بولی۔

”بتا دیں بچو۔ رازداری کا وعدہ کرتا ہوں۔“

تمکین نے اسے بھی مناسب کاٹ چھانٹ کے ساتھ ساری بات بتا دی۔

”لیکن اس میں مسئلہ کیا ہے؟ میرے خیال میں تو ابو آپ کو اجازت دے دیں گے

کیونکہ کم از کم آپ کی حد تک وہ اس قدر تنگ نظر بھی نہیں ہیں۔“

”بات یہ نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا ہے؟“

پھر منو کی مزید باتوں سے بچنے کے لیے اس نے رسالہ کھول لیا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ امی کمرے میں داخل ہوئیں۔ تمکین کا دل زور سے دھڑکا اٹھا۔

”میرا خیال ہے تم چلی جانا ان کے ساتھ۔“ امی نے فریاد خالی سے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔ ”اس کی امی اور بہن ساتھ ہوں گی اس لیے کوئی حرج نہیں ہے۔“

”امی اگر آپ کو پسند نہیں ہے تو میں نہیں جاؤں گی۔“

”بھو!“ منو کے لہجے میں تنبیہ تھی۔ ”ہر کام شروع کرنے سے پہلے دوسروں کے ماتھے پر تیوریاں مت تلاش کیا کریں کیوں ہر وقت آپ کو دوسروں کی پسندنا پسند کا خیال رہتا ہے۔“

”تم چپ کر لو گے!“ امی نے اسے گھورا۔ ”تم ضرور کوئی چاند چڑھاؤ گے اس کا مجھے یقین ہے۔“ پھر وہ تمکین کے سر پر ہاتھ پھر کر بولیں۔ ”بچو گویا یہی سعادت مند ہونا چاہیے۔ ورنہ سسرال میں عزت دو کوڑی کی ہو جاتی ہے۔“

”ہاں امی، آپ پر حنائے جانیں جو کوٹلی چلیاں۔ کبھی اکیلے انہیں دنیا کا سامنا کرنا پڑا تو حالات کے سمندر میں ڈبکیاں کھائی رہ جائیں گی۔ اتنا ڈر پوک بنا دیا ہے انہیں آپ نے۔“

”منو! تم تو ابھی سے ہاتھ سے نکلے جا رہے ہو۔ میٹرک میں کیا آئے ہو سمجھتے ہو، بہت بڑا معرکہ مار لیا ہے۔ ہر چیز پر فتویٰ صادر کر سکتے ہو اب۔“ امی تو غصے سے کھول اٹھیں۔ ”یعنی میں اٹنی پیاز پھاؤں گی اپنی بیٹی کو شرم کروا دوں۔“

”امی یہ تو جو منہ میں آئے بول دیتا ہے۔ سچ نہیں کہہ رہا آپ کیوں غصہ ہوتی ہیں۔ بچے آہستہ آہستہ خود ہی عقل آجائے گی۔“ تمکین نے ہمیشہ کی طرح منو کے دفاع کی کوشش کی۔

”میں سب جانتی ہوں اس کی حرکتیں۔ کتناں پڑھ پڑھ کے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اب اماں باوا گل دکھائی دینے لگے ہیں اسے۔“

”چھوڑیں بھی۔ اس نے تو صرف مذاق کیا تھا۔ آپ آئیں میں آپ کو دکھاؤں۔“ آج تین دوپہوں کے کنارے بنائے ہیں میں نے۔“ تمکین انہیں باہر لے گئی۔

”عقل کی بات تو یہاں کوئی سنتا ہی نہیں۔“ منو کتاب پر جھک کر بڑبڑایا۔ ”سب ہی لکیر کے فقیر ہیں۔“

صبح وہ اس شش و پنج میں مبتلا تھی کہ کون سے کپڑے پہنے۔ اسے کپڑوں اور بینگروں کے ساتھ الجھتے دیکھ کر امی اس کے پاس چلی آئیں۔

”کوئی سادہ سا سوٹ پہن لو۔ اچھا لگے گا۔“ امی نے مشورہ دیا۔ ”یہ نیلا ہی پہن لو۔“

”جی اچھا۔“ کہہ کر اس نے سوٹ بینگر سے اتار لیا۔ تیار ہو کر اور بالوں کو نیلے مینڈ میں باندھ کر اس نے آئینے میں تنقید نگاہوں سے اپنا جائزہ لیا۔

”مہوں ٹھیک ہی ہے۔“ اس نے قدر آدم آئینے کے سامنے خود کو ذرا ویسے سے دیکھا اور کسی قدر مطمئن ہو گئی۔

ابھی اسے تیار ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ زین کی امی اسے لینے آ گئیں۔ انداز بھی ان کے ساتھ اندر چلی آئی۔ زین البتہ کار میں ہی تھا۔

”آئی کی مزاح کیسے ہیں؟“ ندانے اس سے سرگوشی کی۔

”ٹھیک ہیں۔“

”تو ٹیلر بات کرتی ہوں۔ بڑی زوردار تقریر تیار کر کے آئی ہوں۔ دیکھنا آئی ٹیلر ایک منٹ میں اجازت دے دیں گی۔“

تمکین نے اسے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ امی اسے پہلے ہی اجازت دے چکی ہیں۔ وہ ہنس کر چپائے بنانے بچن میں چلی گئی۔

”تم تو کہہ رہی تھیں کہ آئی کبھی اجازت نہیں دیں گی لیکن آئی تو اتنی اچھی ہیں۔ ادھر بات کی ادھر اجازت دے دی اور وہ جو میں نے اتنی محنت سے کل تقریر کی تھی وہ وہی

”حیرت تو ہمیں ہے۔ پہلے ہم زین بھائی سے شادی کے لیے منیں کرتے تھے لیکن ان کا ایک ہی جواب تھا تو کہ ایسی جلدی کیا ہے اور اب یہ حال ہے کہ تمہیں پہلی مرتبہ دیکھنے کے بعد سے لے کر آج تک ہمارا ناک میں دم کیا ہوا ہے۔“

”پہلی مرتبہ تو شاید انہوں نے مجھے غور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔“

”جب ان کے آنے کا مقصد ہی تمہیں دیکھنا تھا تو غور سے کیوں نہ دیکھتے۔ مجھے یاد ہے واپس آ کر تو انہوں نے تمہاری شان میں پورا قصیدہ پڑھ ڈالا تھا۔“

”تمہیں یہاں آؤ آئی بلاری ہیں۔“ امی نے ڈرانگ روم سے آواز لگائی۔
ندا اور تمہیں آگے پیچھے چلی ہوئی ڈرانگ روم میں داخل ہوئیں۔ تمہیں نے کن اکیوں سے زین کو دیکھا جو کچن ہاتھ میں لیے ہوئے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً نظریں چرائیں۔

”پھر چلیں؟“ زین کی امی نے تمہیں کی طرف دیکھا۔

”جی آئی۔“ اس نے نظریں جھکائے بھکائے جواب دیا۔

کار کی بچھلی سیٹ پر ندا کے ساتھ بیٹھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اب کچھ دیر وہ زین کی شوخ لگا ہوں کے حصار سے بچی رہے گی لیکن اس وقت پریشان ہو گئی جب زین نے بیک ویو مرکاز کو یہ تبدیل کر دیا۔ اب وہ دونوں آئینے میں ایک دوسرے کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔

”بھائی بیک ویو مرر اس مقصد کے لیے نہیں ہوتا۔“ ندا بولی۔ ”آپ کہیں نہ کہیں ایک سیڈنٹ کروادیں گے۔“

”ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔“ زین نے انکیشن میں چابی گھمائی۔ ”اور ایک سیڈنٹ تو بہت دن پہلے ہو چکا ہے۔ اب کیا ہوگا۔“

تمہیں کار کے شیشے سے سرک پر دوڑتی گاڑیاں اور پیچھے بھاگتے درخت دیکھ رہی تھی۔

کی ویسی ہی رو گئی۔“

”اچھا؟“ تمہیں نے خرابی میں برتن بجائے۔ ”حیرت ہے۔“ پھر اسے اچانک کچھ یاد آیا۔ ”وہ باہر کار میں ہی بیٹھے ہیں؟“

”جی نہیں آپ کے وہ اندر بلا لیے گئے ہیں۔“ ندا نے ڈبے سے ایک بسکٹ نکالا۔

”ندا پلیز امی کو بلاؤ گی؟“

”بلا لاتی ہو لیکن ابھی ان کی کیا ضرورت ہے؟“

”یہ خرابی لے جاتا تھی۔“

”اتنا گھبراتی کیوں ہو۔ وہاں کوئی غیر تو نہیں بیٹھے ہوئے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔ گھبراہٹ میں مجھ سے کچھ نہ کچھ غلط ہو جائے گا۔ اچھے خاصے امپریشن کا ستیاناس ہو جائے گا۔“

”بڑی فکر ہے امپریشن کی۔“ ندا نے اسے چھیڑا۔

”اب تم تو نہ تنگ کرو پلیز امی کو بلا دو۔“

”آئی کو کیا بلانا ہے، میں خود ہی لے جاتی ہوں۔“ ندا خرابی ڈھکیچٹی ڈرانگ روم کی طرف چلی گئی اور تمہیں وہیں کچن میں نظر ہو گئی۔

”بڑی بے مروت ہو۔“ ندا چائے کا کپ ہاتھ میں اٹھائے کچن میں آ گئی۔ ”اتنی امید بھری لگا ہوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے زین بھائی۔ اس وقت ان کی شکل دیکھنے والی تھی جب تمہاری جگہ میں اندر داخل ہوئی۔“

”اب اتنے بے تاب بھی نہ ہوں گے۔“ تمہیں بولی۔

”واہ جی واہ۔ انہیں تو تمہیں یا ہو گیا ہے۔ تمہارے فراق میں مرے جا رہے ہیں وہ اور تم کتنی ہو کہ بے تاب نہیں ہوں گے۔ وہ تو امی کے پیچھے پڑے ہو۔ نہ ہیں نکا۔“ گرانے کے لیے کہ اس طرح کم سے کم تم بات تو کرو گی۔“

”حیرت ہے۔“ تمہیں ملی۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
زین نے آئینے میں اس کی طرف دیکھا۔

”بکومت۔“ امی نے اسے ڈانٹا۔ ”خواہ خواہ جنگ کر رہے ہو پتی کو۔“ پھر تمکین کی طرف مڑیں۔ ”اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دو۔“
”اچھا سبق دے رہی ہیں آپ۔“ زین مسکرایا۔ ”پہلی دفعہ کسی ساس کو دیکھا ہے ایسا کہتے ہوئے۔“

”ہمارے گھرانے میں کوئی ساس بہو نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں ماں بنی کا رشتہ ہوتا ہے اور میں یہ ثابت کر کے دکھاؤں گی۔“ امی بولیں۔ ”میں تمکین کو بیٹی بنا کر لے جا رہی ہوں۔ تمہاری غلط بات پر تمہیں ٹوکوں گی اور اس کی غلط بات پر اسے سمجھاؤں گی۔“
تمکین مسکرا دئی۔ اسے زین کی امی اچھی لگی تھیں۔ روایتی عورتوں سے ہٹ کر۔ خود بھی خوش رہتی تھیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھتی تھیں۔

زین نے گاڑی برکت علی کے سامنے کھڑی کی۔ وہ چاروں باہر نکل آئے۔ کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے تمکین کے دوپٹے کا پلو بھی بیچ میں پھنس گیا۔ اس نے دوپٹا کھینچ کر نکالنا چاہا۔

”غبریں۔“ زین اس کے پاس چلا آیا۔ ”دوپٹا پھاڑنے کا ارادہ ہے کیا؟“
”نہیں تو۔“ گھبراہٹ میں اس نے فوراً نفی کی۔

اس کی گھبراہٹ دیکھ کر اندازاً زین دونوں ہنس پڑے۔ تمکین کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کا سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آ گیا ہو۔ زین نے دروازہ کھول کر دوپٹے کا پلو نکالا اور اس کے کندھے پر ڈال دیا۔ وہ اتنی بوکھلا چکی تھی کہ شکر یہ ادا کیے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی امی کے پاس چلی گئی۔

”ہوں!“ امی مختلف کپڑے دیکھ رہی تھیں۔ ”کیا رنگ پہننا ہے ویسے پر؟“

”برکت علی پر چلنا ہے۔“ امی نے زین کو بتایا پھر تمکین سے بولیں۔ ”ندا کا تو سارا سامان انہی دنوں میں بنانا ہے۔ ابھی تک میں نے ایک جوڑا بھی نہیں بنایا تھا۔ آج کل تو دو مینے بھی فیشن نہیں چٹا کر کئی چیز آ جاتی ہے۔ پھر پیسے بھی خرچ ہوں اور کپڑا آؤٹ آف فیشن سمجھ کر پیسہ دیا جائے تو کیا فائدہ۔“

”جی!“ اسے خیال آیا کہ اس کے بہت سے جوڑے بھی بیٹی میں پڑے پڑے آؤٹ آف فیشن ہو گئے ہیں اور بہت سے برتنوں کا بھی یہ حساب تھا کہ انہیں کچن کے بجائے میوزیم میں رکھا جاتا تو شاید کسی کام آ جاتے۔

”تم برا نیڈل (عروسی جوڑا) کس رنگ کا بنوا رہی ہو؟“ ندانے پوچھا۔

”ابھی تو نہیں سوچا، امی سے پوچھوں گی۔“

”اتنی سی بات بھی امی سے پوچھنا پڑے گی۔“ زین بھنٹا گیا۔ ”مجھے دہن سرخ کپڑوں میں چاہیے۔“

”جی!“ تمکین نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”جی ہاں۔“ اس نے زور دیا۔

”کیوں پریشان کرتے ہو پتی کو۔“ امی نے اسے گھورا۔

”میں کب پریشان کر رہا ہوں۔ پریشان تو آپ کی ہونے والی بہو نے مجھے کر رکھا ہے۔“

”میں نے؟“ تمکین حیران رہ گئی۔ پریشان کرنا تو دور کی بات اس نے تو کبھی خود سے زین سے بات بھی نہیں کی تھی۔

”تم تو خواہ خواہ ان کی باتوں کو سیریس لے رہی ہو۔“ ندا ہنسی۔ ”ان کی تو عادت ہے مذاق کرنے کی۔“

”یہ تمہیں مذاق لگ رہا ہے ندا؟“ زین جھنجھٹا گیا۔ ”میں بالکل سیریس ہوں۔“

”لیکن میں نے تو کسی کو پریشان نہیں کیا۔“ تمکین نے بے جا پارگی سے کہا۔

”میں اندر چلا جاتا تو تمہاری بھائی کی رہی سہی یادداشت بھی کھو جاتی۔“
 ”ظاہر ہے چیز دیکھ بھال کے لینے میں دیر تو ہو جاتی ہے۔ انسان کو کجی نہیں کرنی چاہیے لیکن بے سوچے سمجھے پیچھے کیٹنا بھی تو کوئی ٹھنڈی نہیں ہے۔“ اسی بولیں۔
 ”اور ابھی آپ کو مزید گھنٹنا بھر کھٹنا پڑے گا۔“ ندا شرارت سے ہنسی۔
 ”کیا مطلب؟ ابھی کچھ رہتا ہے؟“

”جی، سب سے اہم چیز۔ ہم فرحت جیولرز پر جا رہے ہیں۔“
 ”رہنے دو ندا پھر آرڈر دے دیں گے، تمہیں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔“
 ”تمہیں ضرورت نہیں ہے بھائی کی سائیز لینے کی۔ ان کی تو عادت ہے۔ پہلے ہی اتنی دیر کر دی ہے تم نے۔ اب تک تو سب کچھ تیار ہو جانا چاہیے تھا۔“ ندا نے اسے گھینا۔
 ”زیورات پسند کرتے ہوئے بھی اس کی نگاہیں بار بار گھڑی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ پندرہ منٹ، آدھ گھنٹا، پون گھنٹا اور پھر ایک گھنٹا گزر گیا لیکن ندا کو کچھ پسند ہی نہیں آ رہا تھا۔ پوری دکان میں بڑی مشکوں سے چند ایک سیٹ اچھے لگے۔“
 ”کتنی دیر ہو گئی ہے ہمیں یہاں؟“ ندا کو اچانک خیال آیا۔
 ”پورا ایک گھنٹا۔“ تمہیں نے جواب دیا۔

”اوہوزین بھائی تو باہر لال پہلے ہو رہے ہوں گے۔“ ندا بولی۔ ”ایسا کرو تمہیں تم باہر چلی جاؤ تاکہ انہیں تسلی ہو جائے کہ کام ختم ہونے والا ہے۔ میں اور ای آرڈر رکھوا آتے ہیں۔“
 ”میں چلی جاؤں، تمہیں گھبرا گئی۔“ اب کون سی زیادہ دیر لگے گی، اسٹھے ہی چلیں گے۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ کون سی دیر لگے گی۔ تم چلی جاؤ۔ ہم یوں آئے۔“ ندا نے چٹکی بجائی۔ ”جاؤ بھی یار۔“
 تمہیں بادلِ نخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی اسے معلوم نہیں تھا کہ زین کے بہت اصرار پر ندا

”جی ابھی تو نہیں سوچا۔“
 ”تو فوراً ابھی سوچو۔ دن ہی کتنے رہ گئے ہیں شادی میں۔“ امی نے کہا۔ ”مہینہ بھر تو جواز اپنے میں لگ جائے گا۔“
 ”ایک نوٹمکین تم نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ اب یہی پتا ہوتا کہ تم نے برا نیڈل کس رنگ میں بنانا ہے تو اگلے دن کا انتخاب آسان ہو جاتا۔“ ندا نے سر ہلایا۔
 ”وہ تو پھر سرخ ہی ہو گا تاں۔“
 ”کبھی کچھ کبھی ہو سکتی ہے۔“ ندا بولی۔
 ”چھپچھ کیوں پڑ گئی ہو اس کے۔“ امی نے ندا کو گھورا پھر تمکین کی طرف دیکھنے لگیں۔
 ”تم اس کی اٹنی سیدھی باتیں نہ سنو۔ جو رنگ اچھا لگے گا وہ بہن لینا۔“
 ”ایک آئیڈیا ہے۔“ ندا نے چٹکی بجائی۔
 ”کیا؟“ تمکین نے بڑے امید نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”میرا ایسے کا جوڑا اسرخ ہے۔“ وہ بولی۔ ”اس لیے ظاہر ہے عروسی جوڑا مجھے کسی اور رنگ میں بنانا ہوگا۔ میں نے سوچا تھا ٹی پنک کلر میں بنالوں گی۔ اب میری بارات والے دن تمہارا دیر لگے ہوگا۔ کیوں نہ دونوں ایک جیسا بنالیں؟“
 ”یہ ٹھیک رہے گا۔“ تمکین کھل گئی تھی۔
 پھر کتنی ہی دیر تمکین کی بڑی اور ندا کے جینز کے دوسرے جوڑے پسند کرنے میں لگ گئی۔ کافی دیر بعد جب وہ تینوں دکان سے برآمد ہوئیں تو زین کا سر سے نکل کر ان کے پاس چلا آیا۔
 ”آپ لوگوں سے جلدی شاپنگ نہیں ہوتی۔ پورا ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا ہے۔ مجھے یہاں باہر سوکھتے ہوئے۔“ زین کا موڈ سخت آف تھا۔
 ”آپ سے کس نے کہا تھا یہاں سوکھتے کو۔ آپ کے اندر آنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔“ ندا نے کہا۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں؟“

تمکین کو خیال آیا کہ زین کچھ پوچھ رہا تھا۔

”کیا؟“

”میں کہہ رہا تھا کہ فون پر بات کرنے پر تو اعتراض نہیں ہے نا؟“

”پلیز نہیں۔ ای، ایو کیا سوچیں گے۔“ تمکین اب بھی ندا اور امی کی طرف دیکھ رہی تھی جو کار کے بالکل قریب آ گئی تھیں۔

”میں شام جے جے فون کروں گا۔ صرف تم سے بات کرنے کے لیے اور اگر تم نے فون ریسو نہ کیا تو جو بھی کرے گا اس سے صاف کہہ دوں گا کہ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

ندا اور امی بالکل پاس آ چکی تھیں۔ زین نے بات ختم کر کے امی کے لیے دروازہ کھولا۔ تمکین سوچتی رہی کہ اسے منع کرے لیکن موقع ہی نہیں ملا۔

شام پانچ بجے سے ہی وہ بوکھلائی ہوئی پھر رہی تھی۔ منو تھوڑی دیر پہلے کرکٹ کھیل کر آیا تھا اور اب تمکین کی بوکھلاہٹ دیکھ کر اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔

”بنو پاؤں میں پیسے فٹ کرائیں۔ زیادہ آسانی سے پورے گھر میں گھوم پھر سکیں۔“

”میں کب سارے گھر میں گھوم رہی ہوں۔“ وہ لاؤنج میں صوفے پر تنک گئی۔ ”مجھے لگتا ہے جیسے میں کوئی بات بھول رہی ہوں۔ میں تو صرف بھولی ہوئی بات یاد کر رہی تھی۔“

”اتنی عمر ہوگئی آپ کی، اس جھوٹی دنیا میں آئے ہوئے پھر بھی جھوٹ بولنا نہ آیا۔ کیا فائدہ آپ کی اس زندگی کا۔“ منو نے اخسوس سے کہا۔

”تمہیں تحلیل نفسی کے لیے میرے علاوہ کوئی اور معمول نہیں ملتا۔ جب دیکھو میری بات کے نیچے اوپر سے لگتے ہو۔“ تمکین نے زین کا غصہ مٹا دیا۔

نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے امی کو لے کر الگ ہو جائے گی تاکہ زین، تمکین سے اطمینان سے باتیں کر سکے۔ تمکین نے پہلے دروازے سے باہر جھانکا۔ سامنے زین کار سے باہر کھڑا منتظر نظروں سے دکان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ تمکین نے مڑ کر ملتی نظروں سے ندا کی طرف دیکھا لیکن وہ مسکرا کر ان جزاؤں گنگنوں کی طرف متوجہ ہو گئی جو اس کے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ تمکین کو اندازہ ہو گیا کہ ندا اور زین نے پہلے ہی یہ طے کر رکھا تھا۔ پیچھے مڑنا ممکن نہ تھا اس لیے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائی وہ کار کی طرف بڑھی۔ زین نے اس کے لیے دروازہ کھولا پھر اس کے پیچھے کے بعد وہ بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”اتنی دیر سے انتظار کر رہا تھا میں۔“

”آپ کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ تمکین بولی۔

”کیوں؟ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اتنا حق تو ہے ہم دونوں کا کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں اور چند بے ضرر قسم کی باتیں کر سکیں۔“

”تمکین خاموش رہی۔“

”تم نے پہلے دن ہی مجھے اپنا سہرا بنالیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”مجھے تم جیسی ہی لڑکی کی تلاش تھی جس کی زندگی میں یہاں تک کہ اس کی سوچوں میں بھی میرے علاوہ کبھی کوئی نہ آیا ہو۔“

تمکین نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

”مفتی کے بعد سے آج تک چار مرتبہ مختلف بہانوں سے تمہارے گھر آچکا ہوں اور فون تو آن گت کیے ہیں۔ کہاں ہوتی ہو تم؟“

”فون امی ابو کے کمرے میں ہے اور میں آپ کو بتا دوں، امی کو یہ سب پسند نہیں ہے۔“

”فون پر تو بات ہو سکتی ہے نا۔“ زین نے پوچھا۔

تمکین کی نظریں دکان سے نفٹتی ہوئی ندا اور زین کی امی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

”نفیات آپ کا مضمون نہیں ہے اور تحلیل نفسی کا مطلب آپ کو نہیں آتا۔ ویسے میری اہمیت میں بھی اتنے موٹے موٹے لفظ نہیں پائے جاتے۔ آپ سیدھی بات بتادیں، میں آپ کو مسئلہ کا حل بتا دوں گا۔“ منو نے تجویز دی۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے تم اپنے حل اپنے پاس رکھو۔“ ابھی حکمین کی بات بشکل ختم ہوئی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ گھنٹی کی آواز سننے ہی وہ تو گویا اچھل پڑی۔ پھر ساتھ ہی اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ اصولاً یہ زین کا فون نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن اس کا کوئی بھروسہ بھی نہیں تھا۔

ابو نے فون اٹھالیا۔

”ہیلو۔“ پھر کچھ دیر دوسری طرف کی بات سننے کے بعد انہوں نے رائیگ نمبر کہہ کر فون رکھ دیا۔ حکمین کی جان میں جان آئی۔

”ہوں۔ سمجھ گیا۔ سب سمجھ گیا۔“ منو جو اس کی تمام حرکتوں کا جائزہ لے رہا تھا،

بولاً۔

”کلک۔ کیا سمجھ گئے۔ بات ہی کچھ نہیں ہے تو تم کیا سمجھ سب۔“

”فون آتا ہے کوئی؟“

”شش۔“ حکمین نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ ”امی کر لیں گی۔“

منو اسے ہاتھ سے پکڑ کر اس کے کمرے میں لے گیا۔

”زین بھائی کا فون آتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

حکمین نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

”فون یہاں لا دوں آپ کے کمرے میں؟“

”ان کا فون آئے تو کہہ دینا میں سو رہی ہوں۔“

”لیکن آپ تو جاگ رہی ہیں۔“

”تمہیں اس سے کیا میں جو کہہ رہی ہوں وہ کہنا۔“

”آج تک تو میں سبق دیا ہے کہ جھوٹ نہ بولو اور اب خود ہی جھوٹ بولنے کو کہہ رہی ہیں۔“ منو نے کہا۔

”تم تو مجھے پاگل کر دو گے۔ مصلحت پسندی بھی کسی چیز کا نام ہے۔“

”آپ مصلحت پسندی میں ہی کسی دن ماری جائیں گی۔ یہ لکھوا لیں مجھ سے۔“

”تو مسر لقا تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟“

”بہت صاف اور سیدھی بات ہے۔ اگر آپ بات کرنا چاہتی ہیں تو کریں اور اگر نہیں کرنا چاہتیں تو بہانے مت بنائیں۔ صاف صاف کہہ دیں کہ آپ اس بات کو پسند نہیں کرتیں۔“

”خود اپنا ٹکڑا چوہا، وہ بھی مرا ہوا۔“ حکمین نے منہ بتایا۔ ”بہت ہی اچھا حل بتایا ہے۔“

”یہی حل بہترین ہے۔“ منو مضر تھا۔

”میرے بھائی کوئی ایسا طریقہ بتاؤ کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“

”نہ بھی نہ۔ میں چاٹکایا نہیں ہوں۔ نہ ہی چاٹکایا کہ ہم سے دور دور تک کوئی تعقیق

ہے۔ پتا نہیں، آپ میں یہ چاٹکایا پن کہاں سے آ گیا ہے۔“

حکمین اسے گھور کر رہ گئی۔

”بھو! بات کرنے کو دل چاہ رہا ہے؟“ منو نے بہت ہمدردی سے پوچھا۔

اسے ہمدردانہ موڈ میں دیکھ کر حکمین نے اسے ساری بات مناسب تر انیم کے ساتھ بتا

دی۔

”ہوں۔ تو دھونس دے رہے تھے زین بھائی۔“ منو ہنسا۔ ”لیکن دھونس نہ دیتے تو

کیا کرتے۔ بردہ تو آپ ان سے کترائے پھرتی ہیں۔“

”اب تیرہ ہی کرتے رہو گے یا کچھ مدد بھی کرو گے میری۔ صرف پانچ منٹ رہ گئے

ہیں چھ بجتے ہیں۔ ابھی گھنٹی بجے گی اور ابھی ایفون اٹھائیں گے اور ان کا تو کچھ بھروسا

”میں نے آلو پیاز کی قیتوں پر تبصرہ نہیں کرنا کہ جلدی سے کیا اور فون رکھ دیا۔“
 زین جھنجھلا گیا۔ ”تم سے تو تمہاری تصویریں اچھی ہیں جو مسکرا کر میری طرف دیکھتی ہیں۔
 خوشی سے، شہرارت سے اور مجھے دیکھ کر تمہاری طرح چھٹی بھی نہیں ہیں۔“
 ”تو مجھے کیوں فون کرتے ہیں، انہی سے باتیں بھی کر لیا کریں۔“
 ”خود اپنے سے ہی مجلس ہو گئیں۔“ زین نے قہقہہ لگایا۔
 ”جی نہیں۔“

”مجھ سے باتیں کرنے کو دل نہیں چاہتا؟“ زین نے بہت رمان سے پوچھا۔
 ”یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا آپ نے؟“

”حد ہو گئی۔ ہم محترمہ کے لیے مرے جا رہے ہیں۔ دن گن گن کے شادی کا انتظار
 کر رہے رہیں۔ یا اس قدر بے تاب تو میں کبھی نہیں ہوا۔ اور دوسری طرف تم ہو جسے پرواہ
 ہی نہیں کہ کوئی تمہارے متعلق سوچتا ہے۔ تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہیں پانا چاہتا ہے۔ تم
 مجھے میڈیکل سائنس کا ایک نیا کس لگتی ہو۔ مجھے لگتا ہے تمہارے پاس دل نام کی کوئی چیز
 ہی نہیں ہے۔“

”ہوتی تھی یہ چیز پر اب نہیں رہی۔“ تمکین اس کی بات پر خوشی سے ہنسی۔ ”اور محترم
 وہ آپ لے گئے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے ریسیور کرڈل پر رکھ دیا اور کتنی دیر تک گھنٹوں میں سردیے ہنسی
 رہی۔ پھر اس نے اٹھ کر اپنے کپڑوں کی الماری سے وہ لفافہ نکالا جو امی نے بہت دن پہلے
 اسے دیا تھا۔ زین کی تصویر نکال کر وہ اپنے بستر پر جا بیٹھی۔

”تو آپ میری پرواہ کرتے ہیں۔“ اس نے تصویر دیکھتے ہوئے دل میں سوچا۔
 ”مجھے پانا بھی چاہتے ہیں اور مجھ سے محبت بھی کرتے ہیں۔ بہت بے تاب بھی ہیں لیکن
 مجھے یقین ہے کہ اسے نہیں جھٹی میں ہوں۔ جھٹی میں آپ کی پرواہ کرتی ہوں۔ جھٹی میں
 آپ سے محبت کرتی ہوں کبھی اتنی محبت کر کے دکھائیں تو مانوں۔“

نہیں جھج جھج ہی ابو سے مجھے بلانے کے لیے کہہ دیں۔“
 ”تس آ رہا ہے مجھے آپ کی شکل دیکھ کر۔“ منو اٹھ کر کمرے سے نکل گیا اور پھر
 تھوڑی دیر بعد فون سمیت کمرے میں داخل ہوا۔ ”یہ لیں۔“
 ”تم ابو کے سامنے سے فون لے آئے۔“ تمکین کی تو سنی ہی گم ہو گئی۔
 ”کیوں اتنا گنتی فیل کر رہی ہیں۔ ابو کو کیا پتا کہ وجہ کیا ہے۔ انہیں بتا کر آیا ہوں کہ
 میں نے دوست کو فون کرنا ہے۔ آپ کی خاطر جھوٹ بولنا پڑا۔“ منو نے فون اس کے
 قریب قالین پر رکھا۔ ”اب جو چاہے بات کریں اپنے ان سے۔“
 ابھی منو کی بات بمشکل ختم ہوئی تھی کہ فون جھج پڑا۔ تمکین نے ایک نظرفون کو دیکھا اور
 پھر منو کو۔

”میں جا رہا ہوں آپ اطمینان سے بات کریں۔“ وہ کمرے سے نکل گیا۔

تیسری گھنٹی پر تمکین نے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو۔“ وہ گھبراہٹ ہوئی تھی۔

”شکر ہے، تم پر اتنا اثر ہوا۔“ زین نے کہا۔

”آئی آئی آئی تمہیں ورنہ میں نے آپ کو منع کرنا تھا۔“

”وجہ؟“

”بیکس، ابھی ہماری صرف مفتی ہوئی ہے جس کی نہ کوئی مذہبی حیثیت ہے اور نہ

قانونی۔“

”تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟“ زین بولا۔ ”ماتا کہ اس کی کوئی مذہبی یا قانونی حیثیت

نہیں ہوئی لیکن مفتی کا مطلب صرف ایک انگوٹھی پہنانا بھی نہیں ہوتا۔ یہ تو Word of

Honour ہوتا ہے۔ دونوں فریقوں کے سچ۔“

”اچھا آپ جلدی سے بات کر لیجئے جو کرنے کے لیے آپ نے فون کیا ہے۔“

تمکین نے دروازے کی جانب دیکھا۔

”دو گی۔“

”یہ بات بات پر رونے والی عادت چھوڑ جانا نہیں۔“ منو بولا۔ ”اور بجومیری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ رونے دھونے سے کبھی کچھ سنورا نہیں کرتا نہ کسی کو اس کا حق ملتا ہے۔ اپنا حق لینا پڑتا ہے۔ اپنے فرائض پورے کریں اور اپنے حقوق کبھی مت چھوڑیں۔“

تمکین نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ تمکین ہر موقع پر اسے امی، ابو کے غصے سے بچاتی تھی۔ وہ چھوٹا سا تھا تو اس کے کام بھاگ بھاگ کر کرتی تھی لیکن آج وہ اسے بہت بڑا دکھائی دے رہا تھا۔ بالکل پناہ گاہ کی طرح۔

”تمکین کیا کر رہی ہو؟“ کمرے کے باہر سے امی کی آواز آئی۔

”جی کچھ نہیں۔“ اس نے جلدی جلدی تصویر لٹافے میں ڈالی اور لٹافہ ٹیکے کے نیچے رکھ دیا۔

”اپنی طرف کا شادی کا جواز اکب بنانے کا ارادہ ہے؟“ وہ اندر آ گئیں۔ ”اتنے کم دن رہ گئے ہیں اور تمہیں کچھ ہوش ہی نہیں ہے۔“

”ای جب آپ کہیں۔“

”کل شام چلے چلتے ہیں۔ کیوں منو تم فارغ ہو کُل؟“ امی نے پوچھا۔

”آپ حکم کریں۔ جب کہیں، میں چلنے کو تیار ہوں۔“ اس نے ٹینک ناک پر بجائی۔

”میں تو جب حکم دوں ہاں جب صاحبزادے کہیں نظر آئیں۔ یا تو سارا دن کتابوں میں گھسے رہتے ہو یا کرکٹ تمہاری جان کو آئی رہتی ہے۔“

”اس لیے یا تو اسکا لرن ہاؤں گا یا پھر کرکٹر۔ ویسے اسکا لرنے کا کوڑی بھر کا بھی فائدہ نہیں۔ ہاں کرکٹر بن گیا تو عیش ہو جائیں گے۔ پیسہ الگ ملے گا اور تصویریں اور انٹرویو الگ شائع ہوں گے۔ پھر میں پریس والوں کو اپنے ڈکے دی کر کبھی داستان سناؤں گا کہ میں اپنی امی کی تمام تر مخالفت کے باوجود کرکٹر بننے میں کامیاب کیسے ہو گیا۔“

”ہوں۔ کمرے میں اکیلے بیٹھ کر یہی کام ہوتا ہے۔“ منو نے دروازہ کھول کر اندر

چھاٹا۔

”تم دستک دینے بغیر کیوں چلے آئے؟“ تمکین نے تصویر ایک دم الٹ دی۔

”میں نے سوچا کہ یا تو بات نہیں کر رہی تھیں اپنے ان سے یا پھر شروع ہوئیں تو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہیں۔ بس یہی دیکھنے چلا آیا تھا۔“

”فون تو کب کار کھ چکی ہوں۔“ تمکین نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔

”ہاں اور اب تصویر سے باتیں کر رہی ہیں۔“

”نہیں تو۔ یہ تو یہاں پڑی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر کھنے لگی تھی ابھی۔“ تمکین نے اس قدر معصومیت سے کہا کہ منو نے بے اختیار آگے بڑھ کر اسے پیار کر ڈالا۔

”میری پیاری بھو!“ اس نے تمکین کے گلے میں بازو دھاک کیے۔ ”تصویر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے کہ آپ اس سلسلے میں بھی صفائی پیش کر رہی ہیں۔“

”نہیں تو۔“ تمکین جھینپ گئی۔

”پتا ہے بجو آپ چلی جائیں گی ناں تو میں بہت اداس ہو جاؤں گا۔“ وہ اس کے بستر کے سامنے قالین پر بیٹھ گیا۔ ”بہت یاد آئیں گی آپ۔“

”سچ منو۔“ وہ گھر چھوڑنے کے خیال سے اداس ہو گئی۔ ”نئے سفر پر نکلنے کی خوشی میں وہ یہ بھول گئی تھی کہ اسے یہ خوشی بائبل کی ولین پارک کے ہی ملے گی۔“ اداس تو میں بھی بہت ہوں گی۔ بہت مس کروں گی سب کو۔“

”لیں آپ کیوں مس کریں گی ہمیں۔ آپ کو تو وہاں ان شاء اللہ دھیروں پیار ملے گا۔ ہاں میں آپ کو مس کروں گا کیونکہ آپ کی محبت بہت زیادہ تقسیم ہو جائے گی۔ اب سے پہلے تو آپ کی ساری محبت میرے لیے ہوتی تھی۔“

”اتنے اداس ہو گئے۔“ تمکین نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

”تمہاری جگہ تو کوئی نہیں لے سکتا۔ کبھی کوئی نہیں لے سکتا۔ تم اداس مت ہو ورنہ میں رو

”امی کہہ رہی ہیں، جلدی کریں۔“

”اچھا بابا۔“ وہ سب کچھ اسی طرح چھوڑ چھاڑ کر بچن میں آگئی۔

”تمکین؟“ ندا کی آواز آئی۔

”تمکین بچن سے نکل آئی۔“

”کدھر گم تھیں۔ میں نے کونا کونا چھان مارا گھر کا۔“ ندا نے اسے دیکھا تو اس کی طرف چلی آئی۔

”میں اسٹور میں تھی، تم کب آئیں؟“

”ابھی پانچ منٹ ہوئے ہیں آئے ہوئے۔“

”ادھر ہی آ جاؤ بچن میں۔“

”میں نے فون کیا تھا ایک دودن پہلے۔“ ندا کیبٹ کے اوپر بیٹھ گئی۔ ”بتا چلا کہ تم شاپنگ کرنے لگی ہوئی ہو۔“

”ہاں، عروسی جوڑے کا آرڈر دینا تھا۔“

”پھر کیسا بنوا رہی ہو؟“

”سرخ لہنگا اور سنہرا کام۔“

”بہت سوٹ کرے گا تم پر۔“

”تھینک یو۔“

”آج زین بھائی صرف تمہیں دیکھنے آئے ہیں۔“

”مجھے؟ کیوں؟“

”اس کیوں کا جواب تو مجھے معلوم نہیں۔“ ندا نے کہا۔ ”ویسے صبح سے میرے پیچھے

پڑے ہوئے تھے کہ آفس سے واپسی پر تمہیں دیکھنے جائیں گے۔ میں نے کہا بھی کہ لگتا

ہے آپ کا آئی سے مارکھانے کا پروگرام ہے لیکن ہیں اپنی دھن کے پکے کہتے ہیں چاہے

صرف ایک نظر لیکن میں نے تمہیں کو دیکھنا ضرور ہے۔“

”اچھا اچھا دیکھ لیں گے۔“ امی بیزار ہو گئیں پھر تمکین سے کہنے لگیں۔ ”کس رنگ کا بناؤ گی جوڑا؟“

”امی سرخ ٹھیک رہے گا۔“

”ہاں کھلتا ہوا سرخ بہت اچھا لگے گا۔“ امی نے اس سے اتفاق کیا۔ ”غیرا بنوانا

ہے بالہنگ؟“

”لہنگا زیادہ پسند ہے مجھے۔“

”تو چلو کل چل کر دیکھ لیں گے اور ہاں ایک آدھ دن میں چینی کھول کر اس میں رکھی

ہوئی چیزیں بھی ٹھیک کر دو۔“

”امی، اس میں کتنے ایسے جوڑے ہیں جو آؤٹ آف فیشن ہو گئے ہیں۔“

”دیکھ لیں گے ناں جو ٹھیک ہوئے وہ رکھ لیں گے۔“

اس وقت تمکین چینی کھول کر سب چیزیں سیٹ کر رہی تھی کہ منو اس کے پاس چلا آیا۔

”آپ یہاں بھوت بنی کھڑی ہیں اور وہاں آپ کے وہ آئے بیٹھے ہیں۔“

”وہاں کہاں؟“ اس نے تجسس نظروں سے گیلری میں جھانکا۔

”یہاں نہیں ہیں۔ ڈرائنگ روم میں ہیں۔“

”تو تم مجھے کیوں بتا رہے ہو۔“ تمکین نے اپنی طرف سے بے نیازی ظاہر کرنے کی

”کوشش کی۔“

”تاکہ آپ ان کے درشن کر آئیں اور اسی بہانے وہ بھی آپ کا چاند سا کھڑا دیکھ

لیں۔ دونوں کے مفاد کا سوال ہے۔“

”ہو پڑے۔ الٹی الٹی باتیں کرتے ہو۔“

”الٹی باتیں نہیں کر رہا۔ امی نے آپ کو بلا بھیجا ہے کہ آ کر چائے پانی کا انتظام

کریں۔“

”وہ میں کر لوں گی تم جاؤ۔“ تمکین نے برتن قرعے سے ایک کونے میں رکھے۔

کی مسکراہٹ نے اس کی ساری تھکن اتار دی تھی۔

☆=====☆

نگار کو ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں مسہری پر پڑی ہوئی تھی۔ اسے سب کی باتیں سنائی دے رہی تھیں، لیکن آنکھیں کھولنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

”گلگاہے انہیں کوئی سخت شاک پہنچا ہے۔“ کوئی کہہ رہا تھا۔ ”انہیں بہت گھبراہٹ کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی ذہنی دباؤ یا ٹینشن ان کے لیے خطرناک ہوگا اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ان سے کسی کام کے مسئلے میں زبردستی نہ کریں۔“

”ڈاکٹر صاحب! یہ ہمیں اتنی پیاری ہے۔ ہم نے کبھی بھی اس پر کوئی زور زبردستی نہیں کی۔ جو کہتی ہے پورا کرتے ہیں۔ اللہ جانے بیٹھے بھائے کیا ہو گیا میری بیٹی کو۔“ زمرہ بانی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ”گھر آئی تھی تو خوش خوش تھی۔“

”اپنی دے۔ ان کے آرام کا خیال رکھیں۔“

”ڈاکٹر صاحب کوئی دوا وغیرہ۔“ یہ کاجل کی آواز تھی۔

دوا میں نے لکھ دی ہے لیکن بی بی انہیں دوا سے زیادہ آرام اور ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔“

”بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب!“ زرقا بولی۔

”کمرے میں سنا چھا گیا۔ ڈاکٹر کا چکا تھا۔ کاجل اس کے سر ہانے چھٹی اس کا سر دبا رہی تھی۔ زرقا، زمرہ دانی اور پائل بھی اس کے کمرے میں تھیں۔

”مجھے لگتا ہے، اس لڑکے کو دیکھ کر گھبرا گئی ہوگی جو اس سے ملنے آیا تھا۔“ زرقا نے خیال ظاہر کیا۔

”اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟“ پائل بولی۔ ”اس سے ملنے آیا تھا۔ آخر یہ اسے جانتی ہی ہوگی۔“

”اس کی جان بچان ہے ہی کتنی۔ مجھے لگتا ہے، ایسے ہی کوئی منہ اٹھا کے چلا آیا ہو

تھمکین کان کی لوؤں تک سرخ ہو گئی۔ ”لیکن میں ان کے سامنے نہیں جاؤں گی۔ امی، ابو کیا سوچیں گے۔“

”میں کچا کام نہیں کرتی۔“ ندا ہنسی۔ ”زین بھائی کا رزوا لے صوفے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں جاتے جاتے تھوڑا سا دروازہ کھول جاؤں گی۔ تم درشن کر دینا اپنے تاکہ ان کی رات سکون سے گزرے ورنہ بڑا موڈ آف ہوگا ان کا۔ غصے میں بولتے جائیں گے۔ بولتے جائیں گے۔“

”لیکن میرا حلیہ بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔“ تھمکین نے اپنے مسئلے ہوئے کپڑوں کی طرف دیکھا۔

”تم ایسے ہی ان پر بجلیاں گرا دو گی۔“

”تم نے اس دن بھی مجھے جان کر پہلے باہر بھجوا دیا تھا؟“

”ہاں۔“ ندا نے اعتراف کیا۔ ”کیا کروں اتنا گھٹا کیا تھا بھائی نے کہ مجھے بات مانی ہی پڑی۔“

”تم مجھے پتہ ڈاؤنگی امی سے۔“

”آئی کا ایسا خطرناک ارادہ ہو تو میں تمہارے سامنے آ جاؤں گی۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“

جائے کی ٹرائی اندر لے جاتے ہوئے ندا تھوڑا سا دروازہ کھول گئی۔ پہلے تو تھمکین کچھ دیر سوچتی رہی کہ جائے یا نہ جائے پھر تمام رت جمع کر کے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آہستہ سے دروازے کے قریب آئی اور اندر جھانکنے لگی۔ زین سامنے بیٹھا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس وقت وہ جائے پیتے ہوئے شاید الو سے بات کر رہا تھا۔ تھمکین دروازے کی اوٹ سے دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد زین کو احساس ہوا کہ کوئی اس کی جانب دیکھ رہا ہے اور یہ کوئی تھمکین کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔ اس نے مسکرا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے دونوں کی نگاہیں ملیں پھر تھمکین فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی۔ زین کی ایک لمحے

گا۔ یوں بھی اس نے کبھی مردوں کو ڈیل ہی نہیں کیا۔“ زرقا اب بھی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

”خدا جانے کیا کہہ دیا اس منٹوں نے۔ میری بچی تو ویسے ہی اتنی معصوم ہے، ادھر کی لڑکیوں والی تو بات ہی نہیں ہے اس میں۔ کچھ نہیں دیکھا اس نے دیکھو، کیسے پہلی پڑ گئی ہے۔“ زمر دبائی نے آہ بھری۔

”اماں! سوری ہے چپ کر جائیں۔“ کاہل اس کا سر دباتے ہوئے بولی۔

نگار سب کی باتیں سنتی رہی لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ بند آنکھیں عافیت کا بھی ذریعہ ہیں اور فرار کا بھی۔ بالکل ویسے جیسے کوہتر آنکھیں بند کر کے سمجھتا ہے کہ ملی اسے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ساری رات وہ چاروں اس کے کمرے میں چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ پھر کتنے ہی بے کیف دن گزر گئے۔ اب اسے نہ ہنگھروں کی جھڑکار اپنی طرف باقی تھی اور نہ ہی طبلے کی آواز میں کشش محسوس ہوتی تھی۔ وہ ایک دن رقص کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ کتنے دن سے اس نے ہنگھروں کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ سب نے سو سو جنم کر ڈالے کہ کسی طرح وہ کھل کر بات کر لے، انہیں اپنے دکھ، اپنی پریشانی میں شریک کر لے لیکن وہ تو بالکل چپ ہو کر رہ گئی تھی۔ سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھ کر چپ چاپ دیواروں کو ٹکا کرتی۔ یا پھر باہر تاروں کی چھاؤں میں چلی جاتی۔ نچو کے جو بارے میں ایک مرتبہ پھر رونق ہو گئی تھی۔ شاید وہ ملے کیسے ہوئے گھنوں پر راضی ہو گئی تھی۔

”میں نے اتنی کم ہمتی کیوں دکھائی؟“ کبھی کبھار وہ سوچتی۔ ”کچھ تو کہا ہوتا۔ واضح انکار نہیں کر سکتی تو ہنس کر واضح اقرار ہی کر لیتی لیکن یہ بھی کیسے کہہ سکتی تھی۔“ وہ پھر بے چارگی سے سوچتی۔ ”اس میں میرا کیا دوش کہ تقدیر نے یہ جو بارہ میرا مسکن بنا دیا۔ جہاں ہر طرف ہنگ ہے، بے عزتی ہے۔ ملع کے گھنوں پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ اماں کہتی تھیں کہ میں سلفطیں الناسکتی ہوں۔ ہونہ۔ میرے پاس کون سا عزت دار ہونے کا سٹٹکیٹ ہے۔ میں تو کسی عزت دار گھر میں عزت کے ساتھ داخل نہیں ہو سکتی۔ محل میں کیا داخل ہوں گی۔

میں تو اس نے عزتی کا چولا اتارنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں لیکن میرے سر پر عزت کی چادر کون رکھے گا؟ کوئی نہیں۔ جو قلعہ چند نکوں میں فتح ہو جائے اس کا کوئی ایک فاتح نہیں ہوتا۔ اس قلعے کو تو وہ ایک نیا فاتح اپنے پاؤں تلے روند کر گزر جاتا ہے۔“

اس دن بھی زمر مسمری پر گھنٹوں میں سر دیئے بیٹھی یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ زمر دبائی کمرے میں داخل ہوئیں۔

”کچھ تو بتاؤ میری گڑیا ہوا کیا ہے؟“ انہوں نے نگار کے بالوں میں اٹھلیاں پھیریں۔

”اماں! کچھ نہیں ہوا۔“ وہ اپنی بے عزتی کا اشتہار خود کیسے لگاتی۔

”میری طرف دیکھو تو چندا۔“

نگار نے آہستہ سے سر اٹھایا۔

”کیا کوئی لڑکا پسند آ گیا ہے؟“ زمر دبائی نے پوچھا۔

”اماں میرے پاس کسی عزت دار شخص کو پسند کرنے کا اختیار کہاں ہے۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہولے سے ہنسی۔

”نگار تم نے بہت تھوڑی دینا دیکھی ہے۔ تم محفل گننے کے وقت اپنے کمرے میں بند ہو جاتی ہو۔ اگر تم محفل میں شامل ہو کر تیں تو اس چو بارے سے اترے بغیر ہی تم دنیا والوں کا ہر رویہ سمجھ جاتیں۔“ انہوں نے نگار کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ان مردوں کو عشق و عاشقی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں صرف اپنا مطلب پورا کرنا ہوتا ہے۔ یہاں آ کر اور مطلب پورا کر کے یہ چلتے بیٹتے ہیں۔ ان سے کوئی امید ان کا فضول ہے۔ اگر جذبات میں آ کر یہ کسی کو یہاں سے لے جاتے ہیں۔ تب بھی ہم میں سے کوئی اس دنیا میں نہیں بس سکتا۔ اس لیے نہیں کہ عورت وہاں بسنا نہیں چاہتی۔ اس لیے کہ اس دنیا کے باسی طعنے مار مار کر عورت کا کچھ چھلنی کر دیتے ہیں۔ اور پتا ہے یہ مرد کتنے شکی مزاج ہوتے ہیں۔ یہ تو پردے میں رہنے والی عورت کو نہیں بخشتے۔ کوشے سے آئی ہوئی عورت پر کب اعتبار کرنے

ساتھ کرے میں تمہارہ لگی لیکن شاید کبھی نے اسے اس کی دنیا میں واپس لانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اگلے دن کا بل اس کے کمرے میں چلی آئی۔

”کیا کر رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ نگار نے انگریزی کی کتاب بند کی۔ کس چیز میں بھی تو دل نہیں لگ رہا تھا۔

”ہر وقت کتابوں میں گھسی رہتی ہو۔ ایک تو اماں نے تمہیں خاص الخاص بنانے کے لیے پڑھائی میں بھی جوت دیا ہے۔ الگ کرو اس مصیبت کو اپنے سے، تم نے کون سا پروفیسر بننا ہے۔“ کا بل نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے کر میز پر رکھ دی۔

”ہاں ظاہر ہے، میں کیوں پروفیسر بننے لگی۔ میرے لیے تو قدرت نے خود ہی ایک راستہ مقرر کر دیا ہے۔“ نگار نے غمی سے کہا۔

کا بل نے اس کی بات سن کر خوش دلی سے توفیقہ لگایا۔ ”تو اتنی برہم کیوں ہوتی ہو جب حقیقت کو قبول کر ہی لیا ہے اور پھر یہاں تو حڑے ہی حڑے ہیں۔ لیکن تم ابھی اس دنیا میں داخل نہیں ہوئیں اس لیے تم یہ بات نہیں سمجھو گی۔ حالانکہ اصولاً اب تک تمہیں یہاں قدم رکھ دینا چاہیے تھا۔ لیکن خیر اسے چھوڑو۔ اٹھو۔“ کا بل نے ہاتھ پکڑ کر اسے بستر سے باہر کھینچا۔ ”وہاں ہمارے پاس آکر بیٹھو۔ اٹھو۔“

نگار نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر اس کے ساتھ چلی آئی۔

”ارے لڑکی، کتنے دن سے آئینہ نہ دیکھا تم نے۔“ وہ زمر دبائی کے پاس تخت پر بیٹھی تو وہ بولیں۔ ”نہ بال نکلتی کیے ہوئے ہیں، نہ کا بل ڈالا ہے اور آنکھوں کے نیچے کتنے گہرے حلقے بھی بن گئے ہیں۔“

”اماں بس چھوڑیں۔“ اس نے اپنے بے بالوں کا ڈھیلا ڈھالا ناچ ڈالا۔

”کیوں اپنے آپ کی دشمن ہوتی جا رہی ہو۔“ پھر وہ زرقا سے مخاطب ہوئیں۔ ”وہ

بالوں کا برش لانا ڈارا۔“

لگے۔ میں تمہارے فائدے کو کبھی ہوں نگار۔ اگر وہ لڑکا تمہیں پسند تھا تو بھول جاؤ اسے۔ اور تو وہ تمہیں اپنے گھر لے جائے گا نہیں اور اگر لے گیا تو زمانے سے نہیں بچا سکے گا۔“

”اماں آپ نہ جانے کیا سوچ رہی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

وہ کب سعد کو پسند کرتی تھی۔ وہ تو اماں اس سے دور بھاگتی تھی۔ سعد، مونا کا بھائی تھا اور مونا اس کی سہیلی تھی۔ وہ بھلا اپنی سہیلی کے بھائی کے متعلق ایسا کیسے سوچ سکتی تھی لیکن اس دوستی نے اسے کہیں کانپس رکھا تھا۔

”کس سوچ میں گم ہو جاتی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ بولی۔

”کب تک ایسے بیٹھی رہو گی چندا۔ انسان تجربات کی بھی ہے تو کنڈن بنتا ہے۔ اچھے برے ہر قسم کے تجربے انسان کے لیے ضروری ہیں لیکن انہیں روگ نہیں بننا چاہیے۔ زندگی بڑی نعمت ہے، اسے یوں ضائع مت کرو۔“

”اماں آپ کیا چاہتی ہیں؟“

”میں چاہتی ہوں۔ اٹھو سب کے ساتھ ہنو، بولو، رقص کرو۔ گیت گاؤ۔ ویسے ہی جیسے پہلے کیا کرتی تھیں۔“

”اماں مجھے کچھ وقت دیں سنبھلنے کے لیے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”تم جتنا وقت چاہتی ہو، لے لو، لیکن میری جان یوں کمرے میں گم صم بیٹھ کر دیواروں کو تکتے تکتے تم بھی نہیں سنبھل سکو گی۔ اٹھا اور تھک جاؤ گی۔ یہاں سے باہر نکلو۔ کسی کے ساتھ کوئی بات چیت کرو پھر خود ہی سب کچھ بھول جاؤ گی۔ وقت سے بڑھ کر کوئی مرہم نہیں ہوتا۔“

”جی اماں!“

”اچھا اب سو جاؤ۔“

زمر دبائی اس کے اوپر لحاف ڈال کر کمرے سے نکل گئیں اور وہ پھر اپنی سوچوں کے

پھر نگار کو نیچے اپنے سامنے قالین پر بٹھا کر اس کے بالوں میں ہولے ہولے برش کرنے لگیں۔

”دیکھو کتنے بال ٹوٹ رہے ہیں۔ اتنی لاپرواہی اچھی نہیں ہوتی، ان بے چاروں نے کیا تصور کیا ہے جس کی انہیں سزا دے رہی ہو۔“

نگار چپ چاپ گھٹنے پر سر نکائے، آنکھیں بند کیے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

”بائی جی! دیکھیں آج کون تشریف لایا ہے؟“

استاد بندے علی کی آواز سن کر نگار نے سر اٹھا کر اپنی خوابناک گرے آنکھوں سے نو وارد کی جانب دیکھا۔

”چوہدری سلطان بخش۔“ نگار کو خیال آیا۔ ”چند بہت اچھی فلموں کا ہدایت کار۔“

چوہدری سلطان بخش نگار کو دکھا دیکھتا رہ گیا۔

”آئیے آئیے چوہدری صاحب! زہے نصیب، زہے نصیب۔“ زمر دہائی نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔

نگار قالین سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے لمبے بالوں کو ڈھیلے ڈھالے جوڑے کی شکل میں باندھ لیا۔

”اماں! میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔“ پھر وہ زمر دہائی کا جواب سنے بغیر وہاں سے نکل آئی۔

زمر دہائی نے اسے روکنے کا ارادہ کیا، لیکن کاہل نے آنکھ کے اشارے سے انہیں منع کر دیا۔

اپنے کمرے میں آکر وہ پھر بستر میں گھس گئی۔ کچھ کرنے کو اس کا دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ کمرے کا حلیہ بھی بگڑا ہوا تھا۔ میز پر بے ترتیبی سے کتا میں بکھری ہوئی تھیں۔ بستر شکن آلود تھا۔ گلدان میں رکھے پھول مرجھا چکے تھے۔ الماری میں کپڑے بکھرے ہوئے تھے، سنگھار میز کے آئیے کو گرد کی تہہ نے چھپا دیا تھا، لیکن نگار کو کسی چیز سے دلچسپی محسوس نہیں ہو

رہی تھی۔ وہ جو بے حد نفاست پسند طبیعت کی مالک تھی۔ اپنے مختصر سے کمرے کی ایک ایک چیز چمکا کر رکھا کرتی تھی۔ اب یونہی خالی الذہن بیٹھی رہتی تھی۔

”نگارا!“ زمر دہائی نے کمرے کے دروازے سے اسے آواز دی۔

”جی!“

”آ جاؤ، مہمان چلے گئے ہیں۔“

وہ کسی بحث مباحثے کے موذ میں نہیں تھی اور جانتی تھی کہ اگر اس نے انکار کیا تو اماں پھر اسے وہ سب سمجھائے بیٹھ جائیں گی جو وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی، اس لیے وہ چپ چاپ ان کے پیچھے چلی آئی۔

”استاد بندے علی نے چوہدری صاحب سے تمہارا ذکر کیا تھا۔“ زمر دہائی نے اسے بتایا۔ ”انہیں اپنی نئی فلم کے لیے ایک بے حد حسین اور کم عمر لڑکی کی ضرورت ہے۔ تمہیں دیکھ کر تو وہ دنگ ہی رہ گئے۔ بتا ہے کیا کہہ رہے تھے؟ کہنے لگے کہ اتنی حسین صورت دیکھ کر تو دنیا مارن منرو اور صوفیہ لورین کو بھی بھول جائے گی۔ میں اسے اتنی بلند یوں پر لے جاؤں گا کہ کوئی اور اس تک نہیں پہنچ سکے گا۔“

زمر دہائی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا، ان کا دیرینہ خواب تکمیل کے پہلے مرحلے میں تھا لیکن نگار ان کی بات سن کر سُر رہ گئی۔

”اماں! میں کسی کو دنگ نہیں کرتا چاہتی، میرے پر بہت کمزور ہیں، میں اتنی بلندیوں پر جانے کے قابل نہیں ہوں۔“

”پاگل ہوئی ہو، ایسا موقع قدرت بار عطا نہیں کرتی۔ دنیا ترستی ہے ایک چانس کے لیے، کبھی باہر نکل کر دیکھو، اسٹوڈیوز کے باہر لمبی لائن لگتی رہتی ہے، لیکن وہی پوچھتا نہیں ہے اور تمہاری خاطر تو چوہدری صاحب خود چل کر یہاں آئے ہیں۔“

”اماں! میرے لیے زندگی کو اس قدر مشکل نہ بنائیں کہ میں چلنے سے بالکل ہی بیزار ہو جاؤں۔“ نگار نے اپنے ہونٹ کاٹ کر آنکھوں میں اترتے ہوئے آنسوؤں کو

”اسے اس کے کمرے میں لے جا کر سلا دو۔“ زمر دبائی نے کہا۔

☆=====☆=====☆

”زین بھائی! اب اس تصویر کو اتنی حقیت سے تنکا بند کر دیں خود آپ کی نظر لگ جائے گی تحکیم کو۔“ ندانے زین سے کہا جو صوفے پر لیٹا ہوا سامنے دیوار پر لگی تحکیم کی مسکراتی ہوئی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

”ہمیشہ غلط وقت پر آتی ہو۔“ زین اٹھ بیٹھا۔

”میں غلط وقت پر آتی ہوں؟“ ندانے اسے آنکھیں دکھائیں۔

”تو اور کیا۔“ ابھی تو میں نے غم فراق کے قصے اور نشاط و صل کا ذکر چھیڑ رکھا تھا کہ تم نازل ہو گئیں۔“

”ہوں، غم فراق کے قصے، نشاط و صل کا ذکر۔“ ندانسی۔

”لیکن اس نے تکلفاً بھی کوئی بات کرنے سے انکار کر دیا ہوگا۔ بھائی اپنی مگیت پر آپ کی ایک نہیں چلتی۔ کبھی آئے سامنے بات کریں تو مانوں۔ تصویر دیکھ کر ہی خوش ہوئے جارہے ہو۔“

”آئے سامنے کا وقت کبھی آ جائے گا، مجھے تو تمہارے اظہر پر غصہ آ رہا ہے۔ ابھی ہی جاپان کے ٹور پر جانا تھا اسے۔“

”خبردار! اظہر کے متعلق میں کوئی اٹنی سیدھی نہیں سنوں گی۔“ ندانے اسے گھورا۔
”اپنی تحکیم پر بس نہ چلا تو غصہ اظہر پر نکال دیا۔ ایسا مفت کا نہیں آیا ہوا اظہر، کرلیں اپنی شادی پہلے، میں نے روکا ہوا نہیں ہے۔“

”جتا ہے کہ جانے والی ہو، اس لیے خوب بڑھ بڑھ کر بول رہی ہو۔“ زین ہنسا۔

”خیر بول لو، کیا یا کرو گی کہ کس جی سے پالا پڑا تھا۔“

وہ باتیں کر رہے تھے کہ باہر کھٹی گنگناٹھی۔

”اس وقت کون آ گیا؟“ ندانہ بروائی، ”ضرور آپ کا کوئی دوست ہوگا، بے وقت

روکنے کی کوشش کی۔

”زندگی کو تم خود اپنے لیے مشکل بنا رہی ہو اور جینے سے بیزار تم ہو چکی ہو۔ میں تو تمہیں زندگی کی طرف واپس لانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تمہیں باہر سے کوئی کم کر لا کے نہیں دے گا۔ پائل، جامل اور زرقا کا دور تک نہ رہے گا۔ بس آج کل کی بات ہے پھر ان کے لیے کوئی ادھر کا رخ بھی نہیں کرے گا، کیا کرو گی، پھر کہاں سے کھاؤ گی؟“

”اماں! میں کہیں نوکری کر لوں گی۔“ لگاڑی آنکھوں میں امید کی چمک لہرائی۔

”میٹرک پاس لڑکی کو کہیں کوئی ملازمت ملے دیکھی ہے۔ ایم۔ اے والے جوتیاں چٹختے پھر رہے ہیں، کوئی پوچھے والا نہیں انہیں۔“ زمر دبائی نے اسے سمجھایا۔ ”اور یہ یاد رکھو کہ جہاں جاؤ گی، وہاں تم سے عزت کا سرٹیفکیٹ طلب کیا جائے گا، جو ہمارے محلے کے کسی گھر میں نہیں ہے اور اگر تمہیں کہیں نوکری ملی بھی تو تمہارے اس بے مثال حسن کی وجہ سے ملے گی اور وہاں بھی سب تم سے وہی توقعات وابستہ رکھیں گے، جو یہاں آنے والے یہاں کی سب عورتوں سے رکھتے ہیں۔ گزیا، بھیڑیے صرف یہاں آنے والے ہی نہیں ہوتے، باہر کی دنیا میں بھی بہت بھیڑیے ہیں اور انسان کو شیطان بنے میں لگتا وقت لگتا ہے۔“

”اماں میں کیا کروں؟“ آنسو تمام بند تو ذکر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ وہ جانتی تھی کہ آرٹ صرف دنیا والوں کے لیے آرٹ ہوتا ہے، جس کی تصویریں اترتی ہیں، انٹرویو شائع ہوتے ہیں، فلم انڈسٹری کے اندر ایک لڑکی کو جگہ بنانے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہ اس سے جیسا ہوا نہیں تھا۔ وہ یہ سب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اسے روٹا دیکھ کر کا جمل تو پ کر آ گئے، بڑھی اور اسے اپنے ساتھ پلٹا لیا۔

”میری چند ادراوے نہیں ہیں۔“ اس نے پیار سے نگار کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”اسے رو لینے دو، جامل، اس کے دل کا غبار نکل جائے گا۔“ پائل بولی۔

کتی دیر تک وہ روٹی رہی اور جامل اسے تسلیاں دیتی رہی۔

”ہم باہر سے ہی پائے کھائے آجائیں گے۔“ کامران نے اسے یقین دلایا۔
 ”خیر، اپنے سسرالیوں سے تو مجھے کوئی خدشہ نہیں ہے۔ بڑے شریف لوگ ہیں،
 پشتوں سے اس بازار کا منہ بھی نہیں دیکھا ہوگا۔“ زین بولا۔ ”میں امی کو جتاؤں۔“
 ”ایک سے ایک دھماکا موجود ہے یہاں۔“ شعیب نے پائے کھاتے ہوئے اپنے
 تجربات کا رعب جھانڈنے کی کوشش کی۔
 ”چھوڑو بھی اب یہاں کیا رکھا ہے، اب تو سارے ہیرے موتی اور علاقوں میں
 شفت ہو گئے ہیں۔“ کامران نے اسے جھٹلایا۔
 ”تجھے معلوم ہی کیا ہے یار۔“ شعیب اُڑا ہوا تھا۔ ”ابھی شرط لگا سو روپے کی، پھر
 دیکھ کیسے ہیرے دکھاتا ہوں۔“
 ”ایسے ہی گپ نہ مارو یار۔“ زین بولا۔ ”جیسے ہم نہیں جانتے تجھے ہفتے میں ایک بار
 یہاں آکر پائے کھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تجھے اندر کا حال بھی معلوم ہے۔ چپ
 چاپ پائے کھا اور واپس چلنے کی کر۔“
 ”بات تو ایسے کرتا ہے شعیب جیسے یہاں کا راجہ اندر ہو۔“ کامران نے اسے
 چڑایا۔ ”تجھے یہاں کوئی فائدہ نہیں کرائے گی۔“
 ”چلو شرط ہے۔“ شعیب کو ان کی باتوں پر تاؤ آ گیا۔ ”مجھے کون لفٹ کرائے گی، یہ
 بھی دیکھ لینا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ ایسے ہیرے دکھاؤں گا کہ تم دونوں بھی عاشقی معشوقی میں
 مبتلا نہ ہو گئے تو میرا نام شعیب نہیں۔“
 ”چل ہو گئی شرط۔“ کامران آج شعیب کی بات کو غلط ثابت کرنے کے پورے موڈ
 میں تھا۔

”نہ بابا نہ مجھے تو بخشنم لوگ۔“ زین بولا۔ ”میں کوئی عاشقی و عاشقی افور نہیں کر سکتا۔
 وہ بھی اس وقت جب میری شادی میں صرف ایک مہینہ رہ گیا ہے۔“
 ”تم بھی کمال کرتے ہو، اس کی باتوں میں آ رہے ہو اتنی اچھی نگہبر ہوتے ہوئے تم

منہ اٹھا کر چلے آنا انہی کا کام ہے۔“
 ”تم تو میرے دوستوں کی ازلی دشمن ہو۔“ زین اٹھ کر باہر کی طرف چل دیا۔
 اندر کی چیشین کوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ باہر شعیب اور کامران کھڑے ہوئے
 تھے۔
 ”یہ تم کو فتنی کر کے باہل بنی گم ہوئے۔“ کامران نے چھوٹے ہی شکوہ کیا۔
 ”نہیں یار امی نے اتنے کام روپے لے لیے ہیں۔ میں تو ان کی ڈرائیوری کرتے
 کرتے ہی عاجز آ گیا ہوں۔“
 ”چھوڑو یار، ہمیں گولی دیتا ہے۔“ شعیب بولا۔ ”تجھے بھابی نے باندھ لیا ہے۔ ابھی
 سے یہ حال ہے تیرا آگے الٹدی حافظ ہے۔“
 ”اس نے کیا باندھنا ہے، اتنے چکر لگائے ہیں اس کے گھر کے، مجال ہے جو سامنے
 آ جائے۔“
 ”اوہو ہو ہو! پھر تو بہت ظالم نکلیں بھابی۔“ کامران ہنسا۔
 ”تم لوگ اندر تو آؤ، باقی باتیں کھانے پر کریں گے۔“ زین نے کہا۔
 ”نہیں، آج تمہاری طرف کھانے کا پروگرام نہیں ہے، تمہاری طرف تو اب بھابی
 کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے کے لیے آئیں گے۔“ کامران بولا۔ ”آج تو ہم تمہیں لے
 جائے آئے ہیں۔“
 ”کہاں؟“
 ”پائے کھانے جانا ہے شاہی محلے۔“
 ”یار میں مٹنی شدہ بندہ ہوں، رات کو اس وقت شاہی محلے میں پکڑا گیا تو جانتے ہو،
 کیا ہوگا؟“ زین ہنسا۔
 ”نہیں پتہ نہیں گے وہاں تیرے سسرالی اور اگر پہنچ گئے تو خود بھی منہ چھپا کر بھاگیں
 گے۔“ شعیب نے اپنی بات پر خود ہی ہنسنے لگا۔

کسی اور پر کیسے عاشق ہو سکتے ہو۔“ کامران نے اس کی ہمت بندھائی۔ ”اور یہاں ایسی کون سی پریاں ہیں، اگر آج تم نے انکار کیا تو شعیب کا پل پر کبھی نہیں کھل سکے گا اور میں چاہتا ہوں کہ ایک ہی مرتبہ اس کی بولی بند کر دی جائے۔“

”میرے باپ، دادا، پردادا حتیٰ کہ ان کے پردادا تک کسی نے کبھی ایسے کسی محلے کا رخ نہیں کیا۔“ زین ہنسا۔ ”تم مجھے کہاں پھنسا رہے ہو۔“

”ڈر گیا۔“ شعیب نے قہقہہ لگایا۔ ”یار کامران، یہ تو بارگیا یہیں سو روپے، ٹو بھی جلدی سے جیب خالی کر۔“

”نہیں جیب خالی کروں گا اور نہ زین۔“ کامران جھلا گیا پھر وہ زین سے مخاطب ہوا۔ ”حد کر دی تم نے، اتنا سالیقین نہیں ہے خود پر تمہیں؟“

”یقین کیسے ہو سکتا ہے۔“ شعیب، کامران کی جھلاہٹ سے محفوظ ہو رہا تھا۔ ”یہاں اسے ایسی پری دکھائیں گے کہ بھول جائے گا اپنی مقلی نگلی۔“

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔“ زین اب واقعی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ”نہ تو میں تمہیں کو بھول سکتا ہوں اور نہ ہی کسی اور سے متاثر ہو سکتا ہوں۔ یوں بھی یہاں کوئی لڑکی تمہیں کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے۔ یہاں ہو سکتا ہے، یہاں کی لڑکیاں بہت خوبصورت اور بہت ہڈ کشش ہوں لیکن تمہیں کی ایک ہی خوبی اسے ان سب سے الگ کر دیتی ہے کہ وہ بہت پاکیزہ ہے، بالکل صاف پھولوں پر شبنم کے شفاف قطروں کی طرح پاکیزہ۔“

”یہ ساری شاعری دھری رہ جائے گی جب یہاں کے دھماکوں کو دیکھو گے۔“ شعیب کے لہجے میں چیلنج تھا۔ ”جس کے پاس تمہیں لے جاؤں گا، سمجھو، وہ آسان کی پری ہے، سرسوتی ہے، لکشی ہے، پاربتی ہے، ایلروڈاٹ ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ حسین ہے، اس کا سن الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اگر میرس اسے دیکھ لیتا تو بیلین آف ٹرائے کو بھول جاتا اور یوں Trojan war کے بجائے اس وقت پہلی عالمی جنگ ہوتی۔ اٹھوئی دیکھ لیتا تو کلوپلرہ کو مصر سمیت بحر اوقیانوس میں اپنے ہاتھوں سے غرق کر

دیتا۔“

”چپ کر جاؤ اب۔“ کامران نے ہاتھ اٹھا کر شعیب کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

”اب مزید کوئی تشبیہ نہیں بچی۔“

”یہ تشبیہات اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ وہ تو دیکھنے کی چیز ہے۔“

شعیب بولا۔

”گہن تو چاند میں بھی ہوتا ہے، اب تم بھی بتا دو کہ اس میں گہن کہاں لگا ہوا ہے۔“

کامران نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

”وہ بے داغ چاند ہے۔“ شعیب کے لہجے میں یقین تھا۔ ”بس ایک مسئلہ ہے۔“

”مجھے یقین تھا کہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوگا۔“ کامران نے فاتحانہ انداز

میں کہا۔

”اس کے حسن کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ شعیب نے فوراً دفاعی انداز اختیار

کیا۔ ”مسئلہ یہ ہے کہ ابھی اس کی ماں اسے کسی کے سامنے نہیں آنے دیتی۔ اکثر وہاں

آنے والے اس سے پوچھتے ہیں کہ اس ہیرے کو اس نے کہاں چھپا رکھا ہے تو وہ یہی کہتی

ہے ابھی اس کی بیٹی زیر تربیت ہے، پتا نہیں کب تک تربیت ختم کرے گی اس کی۔“

کامران نے ایک فاتحانہ قہقہہ لگایا۔ ”جب اس کی ماں اسے کسی کے سامنے نہیں

آنے دیتی تو تمہیں اس کے متعلق کیسے علم ہوا؟“

”پوری بات تو سن لیا کرو۔“ اب جھنجھلائی کی باری شعیب کی تھی۔ ”اس کی ماں

نے آئندہ بھی برنس چلاتا ہے۔ اتنی بڑی تصویر سجا رکھی ہے اس نے کمرے میں بچی کی۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ تم صرف تصویر پر ہی عاشق ہو گئے ہو۔“ زین نے اس کا

مذاق اڑایا۔ ”تصویر بعض اوقات بہت برا دھوکا ہوتی ہے۔“

”تصویر تو اس کی اصل خوبصورتی کا دس فیصد ہے۔“ شعیب نے کہا۔ ”اے میں

نے صرف ایک مرتبہ سامنے دیکھا تھا اور دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ اس دن اتفاق سے میں اپنے

نظر اور اہل دل کے لیے یہ جیتی جاگتی لڑکیاں نگار کی تصویر کے پس منظر میں بالکل بے جان ہو جاتی ہیں۔

”تو ہماری مطلوبہ لڑکی کا نام نگار ہے۔“ کامران پُر خیال انداز میں بولا۔

”صرف زین کی مطلوبہ لڑکی، کیونکہ اسے بھائی کو بھلانے کے لیے کسی خاص چیز کا دیدار کرنا ضروری ہے۔ تمہارے دل کا کوارٹر کیونکہ غالی ہے، اس لیے تم تو بقیہ تینوں میں سے کسی پر بھی فدا ہو سکتے ہو کیونکہ بری چیزیں وہ بھی نہیں ہیں۔“

”یہاں کا ماحول کیسا ہے؟“ کامران نے پوچھا۔

”یہاں کے باقی علاقے سے بہت مختلف۔“ وہ بولا۔ ”مجھے اسی لیے یہ لوگ پسند ہیں کہ ایک تو یہ لڑکیاں وابیات قسم کا میک اپ نہیں کرتیں، دوسرے یہ لوگ وضع داری قائم رکھتے ہیں، اسی وجہ سے یہاں ہر قسم کے تماش بین نہیں آتے۔ ایک مخصوص طبقہ آتا ہے۔ ویسے یہاں آنے والے اچھے تو بہر حال نہیں ہوتے لیکن بظاہر بھی معزز لوگ ان کے ہاں آتے ہیں۔“

”جب وہ لڑکی سامنے ہی نہیں آتی تو میں بھلا اس تک کیسے پہنچوں گا؟“ زین نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

”میں تمہیں جگہ بتا دیتا ہوں جہاں وہ ملے گی، اس تک پہنچنا یا نہ پہنچنا تمہارا کام ہے۔ نہ پہنچے تو بھی نہ شرط ہار جاؤ گے۔“ وہ بولا۔ ”بات بہت آسان ہے، بیٹنگ سے اندر کی طرف ایک دروازہ کھلتا ہے، اس سے بائیں طرف نکل کر ایک بیلری آتی ہے، جس کے اختتام پر آخری کمراس کا ہے۔ اس کے آگے صحن ہے۔ تم صحن میں کھلی ہوا میں جانے کے بہانے اس کے کمرے میں جا سکتے ہو۔“

”اتنا آسان تھا اس کے کمرے میں جانا تو تم کیوں نہیں گئے اب تک؟“ کامران بولا۔ ”یہ سامنے کو تو میں تیار نہیں ہوں کہ تم نے کبھی کوشش نہیں کی ہوگی۔“

”ظاہر ہے کوشش تو کی تھی۔“ شعیب نے اعتراف کیا۔ ”اور ایک نہیں دو تین مرتبہ

دوست سعد کی طرف چلا گیا تھا، وہیں اسے دیکھا تھا۔ وہ انہما میں رقص کی تربیت لے رہی تھی۔ سعد کی بہن بھی وہاں ڈانس کلاس انیڈ کرتی تھی۔ دونوں میں دوستی ہو گئی لیکن میرا خیال ہے کہ سعد کی بہن کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی دوست کا تعلق کس جگہ سے ہے۔ تم لوگ اسے دیکھو گے تو بس دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔ اس کی سحر انگیز، بلکہ سنہرے لمبے لمبے بال، ستواں ناک اور اس میں پڑی ہیرے کی لوگ، یا قوت جیسے لب، گلاب کی طرح کھلتے ہوئے رخسار، وہ انسان نہیں محض حسن ہے۔“

”اشھوزین ہم بھی اس پری کو دیکھ لیں۔“ کامران کا لہجہ اب بھی مذاق اُڑانے والا

تھا۔

”اونہو ایسے نہیں۔“ شعیب اپنی جگہ ہمارا۔ ”شرط کی رقم بڑھاؤ، میں آج کل کو کھال ہوں، سو روپے میں پریوں کا دیدار نہیں کر سکتا۔“

”سو رہنے دو، لینے کے دینے پڑ جائیں گے تو کہاں سے لاؤ گے؟“ زین ہنسا۔

”یہ تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم نے اسے دیکھا نہیں ہے۔ میری فکر چھوڑو تم رقم

بڑھاؤ۔“

”دو سو روپے؟“ کامران نے پوچھا۔

”نہیں چائے سو تمہارے اور چائے سوزین کے۔“

”منظور۔“ زین بولا۔ ”بلکہ تم چاہو تو ہزار یا دس ہزار کی بھی شرط لگا لو۔“

”میں تمہارے نوے میں اتنے بڑے ڈینٹ نہیں دالتا چاہتا۔“

”میرے نوے کو کچھ نہیں ہوگا، تم البتہ ہزار روپے تیار رکھنا، چائے سو میرے اور چائے

سو کامران کے۔“ زین اٹھ کھڑا ہوا۔

”لڑکی کا نام تو بتا دو۔“ زمر دبائی کے چوہارے کی طرف جاتے ہوئے کامران نے

پوچھا۔

”سامنے تین رہتی ہیں۔ پائل کا محل، پائل اور زرقا خوبصورت ہیں یہ تینوں بھی، لیکن اہل

کی تھی بلکہ مجھے اس کے کمرے کا پتا بھی محض اتفاقاً چلا تھا۔ ایک دن کمرے میں کچھ محسوس ہو کر میں صحن میں جانے کی غرض سے گیلری میں داخل ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے ایک آچل لہراتا ہوا اس کمرے میں غائب ہو گیا ہو۔ دروازہ بند ہو گیا تو میں دبے قدموں آگے بڑھا۔ کمرے سے انگریزی کے نوٹس یاد کرنے کی آواز آرہی تھی۔ اتنی مہر کہ کیا بتاؤں۔“

”پھر؟“ اب کامران کے لیے میں اشتیاق تھا۔

”پھر یہ کہ میں کافی دیر تک منتار ہا۔ اچانک گیلری میں قدموں کی آواز بھری تو میں پلٹ آیا۔ زرقا مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آگئی تھی۔“ شعیب نے بتایا۔ ”پھر ایک مرتبہ میں وہاں گیا تو دروازے کے نیچے سے لائٹ نظر آرہی تھی لیکن کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ کتنی دیر تک میں ہمت مجتمع کرتا رہا لیکن اتنی ہمت مجھ سے جمع نہ ہو سکی کہ دروازے پر دستک دیتا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ پھر گیا تو کمرے سے گھٹکھروؤں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ اتنی مہر، اتنی خوبصورت کہ کیا بتاؤں، پہلے تو میں منتار ہا پھر دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا، لیکن وہ بند تھا۔ دستک دی، ایک بار پھر دوسری مرتبہ، لیکن یا تو اس نے سنائیں یا پھر توجہ نہیں دی کیونکہ گھٹکھروؤں کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ میں وہاں زیادہ دیر تک رک نہیں سکتا تھا، مجھے دھڑک دھڑک پھر کوئی آجائے گا۔“

گلی میں ہر طرف چاندنی نکھری ہوئی تھی۔ چوباروں میں جتنی رونق تھی، باہر اسی قدر سنسانا کا راج تھا۔ رات بہت بھگ بھگی چلی تھی۔ ان کے قدموں کی چاپ، طبلے کے سروں اور گھٹکھروؤں کی جھنکار سے ہم آہنگ ہو کر ایک عجیب سا ماحول بنا رہی تھی۔ خشکی کا بڑھ گئی تھی۔ وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چوبارے کی سیزمیاں چڑھنے لگے۔

بیٹھک میں محفل عروج پر تھی۔ موچے کی مہک تھی، طبلے اور سارنگی کے خوبصورت سر تھے۔ گھٹکھروؤں کی جھنکار تھی اور ایک حسینہ بہت خوبصورت رقص کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

شعیب نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ حسینہ خاصے ذہنک کے میک آپ میں تھی اور اس کا لباس بھی خوبصورت ذوق کا آئینہ دار تھا لیکن یہ سب کامران اور زین نے بہت دیر سے محسوس کیا۔ انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی دیواروں پر نگار کی تصویر کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں اور پھر ان کی نگاہیں اس کی تصویر پر جم کر رہ گئیں۔ وہ واقعی آسمانی پری تھی، سرسویٰ تھی، پارتی تھی، الفرو ڈائنٹ تھی اور نہ جانے کیا کیا تھی۔ اس مجسم حسن کو دیکھ کر انہیں ہر احساس بھی نہ ہوا کہ زمر دہائی انہیں خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔

”بیٹھ جاؤ۔“ شعیب نے انہیں نہو کا دیا تو وہ ہوش کی دنیا میں واپس آئے۔

”کیسی رہی؟“ اس نے سرگوشی کی۔ ”آتے ہی لو ہو گئے؟“

”اس حسن کی داد نہ دینا تو زیادتی ہوگی۔“ زین نے آنکھلی سے اعتراف کیا۔ ”لیکن داد تو میں بروک شیلڈ اور صوفیورین کو بھی دیتا ہوں۔“

”خیر آگے بھی دیکھ لیں گے۔“ شعیب ہنسا۔

طبلے کی تھاپ اور سارنگی کے سروں پر موچے کی خوشبو میں یہی حسینہ کا جسم کسی گلاب کی شاخ کی طرح تل کھارہا تھا۔

”یہ زرقا ہے۔“ شعیب نے تعارف کرایا۔

گو کہ وہاں بازاری پن نہیں تھا لیکن زین کے لیے یہ احساس ہی تکلیف دہ تھا کہ یہاں عورت کا قیادار اور پاکیزگی کا تار تار ہو رہی تھی۔ اس کا حسن اور ادائیں یک رہی تھیں۔ وہ عورت جسے ایک گھر کی محفوظ چار دیواری میرس ہونی چاہیے، جس کا آنچل تقدس علامت ہونا چاہیے، جس کا حسن شرم و حیا میں لپٹا ہوتا چاہیے، وہ یہاں چند سکون کے عوض یک رہی تھی۔ اسے کجی سنوری یہ لڑکیاں بہت بے بس محسوس ہوئیں۔ اسے ان پر ترک آنے لگا۔ یکا یک موچے کی مہک میں یہی وہ بیٹھک اسے عورت کی بے حرمتی کی بومیں لپٹ نظر آنے لگی۔

اس نے شعیب اور کامران کی طرف دیکھا۔ شعیب تو یوں بھی پرانا پانی تھا، لیکن

کامران کے لیے یہ سب کچھ نیا تھا۔ اس کے تو حواس ہی ساتھ چھوڑتے لگ رہے تھے۔ زین آہستگی سے اٹھ کر جھک سے ملحق گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھا۔ گو کہ اسے معلوم تھا کہ نگار کا کمر اس جانب ہے لیکن وہ دبے قدموں اس کے کمرے سے آگے نکل گیا۔ اس کا اس وقت کھلی ہوا میں سانس لینے کو دل چاہ رہا تھا، اس نے نگار کے کمرے میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کی نظروں کے سامنے تمکین کی بے حد معصوم اور سادہ تصویر ابھرائی۔ کتنی پاکیزہ، کتنی مقدس تھی وہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس کی اپنی تھی، صرف اور صرف زین کی۔

وہ نگار کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شعیب نے جو کچھ کہا تھا، وہ نگار کے حسن کے لیے بہت کم تھا۔ تمکین حسن میں کسی صورت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ تمکین بہت کیوٹ تھی، جانوسی، لیکن نگار سارہ تھی، حسن مجسم، اس کی خاطر سلطنتیں داؤ پر لگائی جا سکتی تھیں۔

پھر بھی اسے نگار میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ویسے ہی جیسے بروک شیلڈ، صوفیہ لورین اور ٹیلر اسے پسند تھیں لیکن صرف اسکرین پر۔ وہ ان کے حسن کا معترف ضرور تھا لیکن خواہش مند نہیں، اس کے لیے تمکین سے بڑھ کر اور کوئی نہیں تھا۔

صحن کی خشک فضا میں پہنچ کر اس نے جیکٹ کے کالر اوپر کر لیے اور جب سے سگریٹ نکال کر سلگائے لگا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ جھنگے کے پاس کوئی اور بھی موجود ہے۔

☆=====☆

رات کے آغاز کے ساتھ ہی پورے چوبارے میں گھنگھر وؤں کی مدھر جھک کار بھیل گئی۔ نگار کو اپنے کمرے میں گھنٹن محسوس ہونے لگی تو وہ شمال اوڑھے ہمیشہ کی طرح باہر چلی آئی۔ اس وقت آسمان بالکل شفاف تھا اور اس کی گود میں نکھرے ہوئے ستارے ٹٹٹا رہے تھے۔ چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا کہیں دور سے موہیے کی مہک اپنے ساتھ لا رہی تھی۔ وہ جھنگے سے ٹیک لگا کر اپنے موجودہ حالات کا جائزہ لینے لگی، اس کے لیے سب راہیں بند تھیں۔ سوائے اس ایک راہ کے جس پر اس نے اب تک قدم نہیں اٹھائے تھے، لیکن اب حالات اسے اسی راہ کی جانب دھکیل رہے تھے۔ وہ مڑنا چاہتی تھی لیکن فرار کے تمام راستے مسدود تھے۔

اس کے پاس کوئی چوائس ہی نہیں تھی، وہ مزید ہٹک، مزید بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ملع کیے ہوئے جہوں پر راجسی نہیں ہونا چاہتی تھی لیکن اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اپنی تمام زندگی اسی بے عزتی کے ساتھ گزارنی ہوگی۔ اس قفس میں اسے کوئی روزن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بنجرے کی دیواروں سے سرکرا رہی تھی لیکن کوئی درد اور نہیں ہو رہا تھا، وہ سسک اٹھی، اس کی آنکھوں میں دھیروں پانی اُتر آیا۔

”یا اللہ!“ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”تُو نے مجھے کیوں شعور دیا؟ کتنے سکون سے زندگی گزار رہی تھی میں، تُو نے یہ آگہی دے کر مجھے اس دنیا کے قابل نہیں چھوڑا اور پھر یہاں کے سب در بھی بند کر دیئے۔ کتنا اچھا تھا، جب میں لاعلم تھی، بے خبر تھی، کتنی

آسانی سے یہ ذلت بھری زندگی قبول کر رہی تھی میں، لیکن اب میں اسے قبول نہیں کر سکتی۔ میں کوئی ہنک کوئی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی۔“ اس نے سر گھٹنوں میں دے دیا۔ ”کیا میری آئیں بے اثر ہیں یا پھر ٹوٹی بہت مصروف ہے اور اپنے بندوں کی فریادیں سنتا۔ اگر تو نے میرے لیے عزت کا دروازہ نہ کھولا تو میں سمجھوں گی کہ تو کسی مظلوم کی دادری نہیں کرتا کسی کو دکھوں سے نجات نہیں دلاتا۔ پھر میں تجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔ کبھی نہیں کبھی بھی نہیں۔“ وہ روئی گئی۔ ”کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ ”ٹھیک ہے اگر میں عزت سے زندہ نہیں رہ سکتی تو عزت سے مر تو سکتی ہوں۔ میں نے جس راستے پر اب تک قدم نہیں بڑھائے۔ اس پر آئندہ بھی میرے قدم کبھی نہیں اٹھیں گے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆=====☆=====☆

وہ کسی لڑکی کا بھول تھا جو زین کو دکھائی دیا تھا۔ شال میں لپٹی ہوئی وہ لڑکی چودھویں کے چاند کی روشنی میں کوئی یونانی دیوی لگ رہی تھی۔ اس نے جھگڑے سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ بلکی بلکی ہوا سے اس کے کھلے ہوئے بے تحاشے بال اُڑ رہے تھے۔ وہ فضا میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ شاید دوسری ستارے کو دیکھ رہی تھی۔ چاندنی میں زین کو اس لڑکی کو پہچانے میں ذرا سی دیر نہیں لگی۔ وہ یقیناً نگار تھی۔ زین کو خیال آیا کہ نگار کے کمرے کی لائٹ آف تھی۔ شاید وہ کافی دیر سے وہاں موجود تھی۔ اس سے پہلے کہ نگار اس کی جانب متوجہ ہوتی زین نے چاہا کہ وہ وہاں سے چلا جائے۔ اس نے سگریٹ فرش پر پھینک کر اسے بستر سے اسلوا اسلوا جانے کے لیے مزاحیہ سکسوں کی آواز سن کر ایک دم ہچک گیا۔ آواز اسی جانب سے آ رہی تھی جہاں نگار کھڑی ہوئی تھی۔

زین نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ آنسو متواتر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ اپنی بے عزتی پر رو رہی تھی۔ اپنی موجودہ حیثیت پر اللہ تعالیٰ سے شکوہ کر رہی تھی اور اپنی عزت کے آگینے کی حفاظت کے لیے اس سے فریاد کر رہی تھی۔ زین وہیں کھڑا رہ گیا۔ یوں جیسے زمین نے اس کے قدم جکڑ لیے ہوں۔ اس نے چودھویں کے چاند

کی جانب دیکھا جو چاندنی پھیلانے کے باوجود باد اُٹھ رہا تھا۔ اسی کی طرح ملکوتی حسن کی دیوی نگار بھی گہنا جگتی تھی۔ اس کی اس چوہارے پر موجودگی ہی اس کا گہن تھا۔ اس کا داغ تھا۔ ایسا داغ جسے چاہتے ہوئے بھی وہ دھونے سے قاصر تھی۔ زین ایک تک اسے دیکھے گیا۔

اب وہ گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھی، موہے کی مہک، طبلے کی تھاپ، گھنگھر وؤں کی جھنکار کے بیچ اس کی یہ سسکیاں بہت عجیب تاثر دے رہی تھیں۔

پھر اس نے سر اٹھایا۔ ”اگر میں عزت سے زندہ نہیں رہ سکتی تو عزت سے مر تو سکتی ہوں۔ میں نے جس راستے پر اب تک قدم نہیں بڑھائے اس پر آئندہ بھی میرے قدم کبھی نہیں اٹھیں گے۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور تقریباً بھاگتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔ ”کیا یہ خودکشی کرنے جا رہی ہے؟“ زین کے ذہن میں پہلا سوال یہی ابھرا۔ اپنے خیالات میں گم نگار نے اسے صحن میں کھڑے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔

بیٹھک میں محفل عروج پر تھی۔ طبلہ اور سارنگی کی آوازیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ گھنگھر وؤں کی جھنکار اور دادو تحسین کا شوران و دیواروں سے بھی پار جا رہا تھا۔ نگار کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ دروازہ کھلا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک میز تھی اور وہ اس میز پر پڑی شال کا پھندا اپنا کر چھت میں نصب ٹکے میں اٹکانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

”احتمال لڑکی!“ زین اس کی جانب بڑھا۔ ”کیا کر رہی ہو؟“ نگار نے دشت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”تم کون ہو؟ کیوں آئے ہو یہاں؟“ وہ چیخ پڑی۔ ”اکیلا چھوڑ دو مجھے۔“

زمین سنی اُن سنی کر کے اس کے قریب گیا اور ایک جھٹکے سے شال اس کے ہاتھ سے کھینچ لی۔ ”اسے اس کام کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔“ زمین نے شال کی گرہ کھولی۔ ”نیچے اترو۔“

”تم کیوں آئے ہو؟ کس کی اجازت سے آئے ہو؟“

”میں تمہارا دشمن نہیں دوست ہوں۔“ زمین نے اپنے لہجے میں حتی الامکان دوستانہ پن پیدا کیا۔

”ہونہر۔ دوست ہو۔“ اس نے نفرت سے اس کی جانب دیکھا۔ ”جیسے مونا تھی، جیسے نازش تھی۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑی۔

”آئی ایم سو ری میں مزید دوستوں کی منتہل نہیں ہو سکتی۔“

”اس دنیا میں سبھی انسان برے نہیں ہوتے۔“ زمین کو معلوم نہیں تھا کہ مونا نازش کی دوستی نے اسے کیا غم دیا تھا۔ اس لیے اس نے دفاعی انداز اختیار کیا۔ ”مثلاً دلدل کے بچ رہتے ہوئے بھی تم کنول کے پھول کی طرح شفاف اور مقدس ہو۔ اسی طرح میں بھی برا نہیں ہوں۔ آج شاید تمہاری جان بچانے کے لیے قدرت نے مجھے یہاں بھیجا تھا ورنہ میں نے تو یہاں آنے کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“

نگار چند ثانیے تک بے نتیجے سے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر میز پر بیٹھ کر رونے لگی۔

”میں نے اللہ تعالیٰ سے جان بچانے کی فریاد تو نہیں کی تھی۔“ اب وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ ”میں نے تو اس سے کچھ اور مانگا تھا۔ صرف اتنی فریاد کی تھی کہ وہ میرے لیے عزت کا دروازہ کھول دے۔ تم اگر صرف مجھے بچانے آئے ہو تو واپس چلے جاؤ کیونکہ میں نے یہ دعائیں مانگی تھی۔ میں سمجھ لوں گی اللہ تعالیٰ آسمانوں میں بہت مصروف ہے۔ میری فریاد، میری آہ و فغاں اس تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ پھر میں خود جاؤں گی اس کے پاس، اس سے انصاف طلب کرنے کے لیے لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے میری فریاد سن لی ہے اور تم میرے

لیے رحمت کے فرشتے بن کر آئے ہوتو۔“

ابھی بات نگار کے منہ میں ہی تھی کہ زمین نے اسے شال اوڑھادی۔

”میں رحمت کا فرشتہ تو نہیں ہوں لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد سن لی ہے۔“

☆=====☆=====☆

تمکین کو منو پر بے تحاشا پیار آ رہا تھا۔ چھوٹا ہونے کے باوجود اس نے سب سے بڑے بڑے کام اپنے ذمے لے لیے تھے۔ لائسنس، شامیانوں، قاتلوں اور کرسیوں کا انتظام کر لیا تھا۔ مندی کئے دن کے لیے کھانا پکانے والے ڈھونڈ لیے تھے۔ اکبری منڈی سے سارے مرچ مصالحے لے آیا تھا۔ کرکٹ کھیلنا اس نے بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ امتحان سر پر تھے وہ دن کو شادی کے انتظامات کی بھاگ دوڑ میں لگا رہتا تھا اس لیے رات گئے تک پڑھنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ اس نے نہ صرف تمکین سے مختلف کھانے پکانے کی فرمائشیں بند کر دی تھیں بلکہ اسے تو تمکین کے کچن میں گھسنے پر بھی سخت اعتراض تھا۔ اسے برتن دھوتے دیکھتا تو سر پر آسوار ہوتا۔

”بجو، آپ کیوں برتن دھور ہی ہیں۔ اتنے خوبصورت ہاتھ خراب ہو جائیں گے اور ناخن بھی ٹوٹ جائیں گے۔“

”میں نہیں دھوؤں گی برتن تو اور کون دھوئے گا۔“ وہ ہنس پڑتی۔

”میں دھوؤں گا آپ نہیں۔“

”مجھے کچن میں گھسنے والے مرد قطعاً پسند نہیں ہیں۔“

”آپ فحشی ہیں یا زبردستی بنائوں۔“ وہ دھمکی دیتا۔

”اگر تم نے زبردستی کی تو میں بھی تمہیں سبق سکھاؤں گی۔“ وہ بھی اڑ جاتی۔

”کیا کر لیں گی میرا؟“

”یہ جو صابن لگا ہے ہاں ہاتھوں پر، یہ تمہارے منہ پر مل دوں گی۔“

”آپ کے ہاتھ آگیا تو مل دیا۔“ منو اس کا مذاق اڑاتا۔

”اچھی لڑکیاں کام سے نہیں گھبراتیں۔“ امی نے ہمیشہ والا جواب دیا۔ ”اور جو میری

بچی ہے، یہ تو میرا ہے۔ وہاں سب کے دل جیت لے گی۔“

منو وہیں قائلین پر دراز ہو گیا۔ ”اب بس کریں یہ سوئی میں دھاگا ڈالنا۔“ اس نے ہاتھ لہبا کر کے تمکین کے ہاتھ سے سوئی چھین لی۔ ”کبھی تھوڑی دیر کے لیے آرام بھی کر لیا کریں۔“

”ہاں تھوڑی دیر کر سیدھی کر لو۔ صبح سے لگی ہوئی ہو۔“ امی نے بھی پیار سے کہا۔

تمکین صوفے پر آئی پاتی مار کر بیٹھ گئی۔

”میں نے تم سے چند ضروری باتیں کہنی تھیں۔“ تھوڑی دیر بعد امی بولیں۔

”جی امی کہیں۔“ تمکین ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”دو سے تو مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے لیکن پھر بھی چند باتیں بتانا والدین کا فرض ہوتا ہے۔“

”آپ بتائیں میں سن رہی ہوں۔“ وہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”تم میں لڑنے بھڑکنے کی عادت نہیں ہے، بہت اچھی بات ہے، بعض اوقات جیسے اپنے گھر میں بھی کسی کی اچھی بڑی سنی پڑتی ہے اسی طرح ہو سکتا ہے کہ کبھی سسرال میں بھی کوئی غصہ کرے، تو اس کا برا نہ مانا۔ نہ نیکی کی بات سسرال میں کہنا نہ سسرال کی بات میکے میں۔ اس طرح بہت سی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں اور حالات سنورنے کے بجائے گبڑتے ہیں۔ اپنے شوہر کے آرام و آسائش کا ہمیشہ خیال رکھنا اور یاد رکھنا کہ ماں باپ کے گھر سے بچی ذولی پر رخصت ہوتی ہے اور جنازہ سسرال سے اٹھتا ہے۔“

تمکین نے شرارت سے منو کو دیکھا جو امی سے اختلاف کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ تمکین کو شرارت سے مسکراتے دیکھ کر اس کا مودا اور آف ہو گیا۔

”اور بچو والدین کے علاوہ بھائیوں کا بھی فرض ہے کہ وہ رخصت ہوتی ہوئی بہنوں کو عقل کی کوئی بات سکھائیں کیوں امی؟“ اس نے تائید طلب نگاہوں سے ان کی جانب

”میں ابو سے شکایت کروں گی۔“

”یعنی جاتے جاتے بھی حرمت کرانے کا پروگرام ہے۔“ وہ ہنستا۔ ”ویسے جوانی

نے ایک ماسی بھی تو رکھی ہے برتنوں کے لیے۔“

”وہ صبح آئے گی اور مجھے ساری رات اُلجھن ہوئی رہے گی کہ برتن گندے پڑے

ہوئے ہیں۔“

پھر وہ چیختی رہ جاتی لیکن منو اس کے ہاتھ سے برتن لے کر دھو ڈالتا۔

اس دن بھی وہ پریس سے شادی کے دعوت نامے لے کر آیا تھا۔

”اب انہیں تقسیم کرنے کی بھی سوچیں۔“ امی نے ابو سے کہا۔

”بلاؤ منو کو نام لکھنے کے لیے۔“ ابو بولے۔

منو قلم لے کر ابو کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مہمانوں کی لسٹ کھولی گئی اور دونوں اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ تمکین دوسرے کمرے میں بیٹھی جوڑے ٹائیک رہی تھی۔ صوفیہ اور رباب کچھ دیر پہلے ہی گئی تھیں۔ امی اٹھ کر اس کے پاس آگئیں اور اس کی مدد کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد منو بھی دعوت نامے اٹھائے ان کے پاس ہی آ گیا۔

”امی جی، ابو کبر رہے ہیں کہ شام کو تیار رہیں۔ دعوت نامے بانٹنے جانا ہے۔“

”اچھا۔“ امی بولیں۔

”بجو آپ ابھی تک کام میں لگی ہوئی ہیں۔“

”ظاہر ہے۔ اتنا کام کھرا ہوا ہے، کون سمیٹے گا۔“

”اور وہ آپ کی سہیلیاں جو مدد کرنے کا کہہ کر آئی تھیں، مجھے تو نہیں لگتا کہ انہوں

نے چائے پیئے اور سبک کھانے کے علاوہ کچھ کام کیا ہے۔“

”تمہیں تو ان کا کوئی کام نظری نہیں آتا۔“ تمکین نے اسے گھورا۔

”امی آپ نے بھی انہیں کام میں جوت رکھا ہے۔ اب ختم کرانیں ان سے کام۔

اپنے گھر میں مرضی ہے چاہے کرتی پھریں۔“

ای جو پچھلے دنوں اسے شادی کے انتظامات میں جتا دیکھ کر اس کی سعادت مندی اور فرمانبرداری کی قائل ہو چکی تھیں ایک دم یوں۔

”کیوں نہیں کیوں نہیں۔ آخر رخصت تو تم ہی نے کرنا ہے بہن کو۔“

”ہاں تو بھو یہ چند نصیحتیں پلو سے باندھ کر رکھنا۔“ منو بولا۔ ”آپ کو ایسی لڑکی نہیں جتنا کہ سسرال والے سر پر جو تے لگائیں اور آپ چپ چاپ نیچے میں منہ چھپا کر اور آنسو بہا کر افسانوی ہیروئن بننے کی کوشش کریں کیونکہ یہ آپ کی زندگی ہے افسانہ نہیں جس میں دس بارہ صفحات کے بعد اچانک آخری چند لائنوں میں ہیرو کو عقل آ جاتی ہے۔ حقیقی زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ رونے سے کسی کو قائل نہیں کیا جاسکتا۔“

دوسری بات یہ کہ حالات کے ہاتھوں مرنے والی لڑکی کا جنازہ کسی بھی جگہ سے عزت کے ساتھ نہیں اٹھتا۔ خواہ وہ سسرال ہو یا ماں باپ کا گھر۔ ماں بہت اور جرأت والی لڑکیاں نہ صرف باعزت طور پر زندگی گزارتی ہیں بلکہ ہر جگہ سے باعزت طور پر رخصت بھی ہوتی ہیں چاہے والدین کے گھر سے رخصت ہوں یا سسرال سے آخری سفر کے لیے۔

اور سب سے اہم بات یہ کہ شوہر کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا آپ کا فرض ہے اور سب کا فرض اس کا بھی ہے۔ اگر وہ اپنا فرض پورا نہ کرے تو اس سے اپنے اس حق کا مطالبہ کریں۔ اگر وہ پھر بھی آپ کو آپ کا حق نہیں دیتا تو یاد رکھیں، شادی کے بعد ماں باپ اور بھائی غیر نہیں ہو جاتے۔ اندر ہی اندر کڑھنے کے بجائے اپنے بھائی کو بتائیں۔ میں آپ سے چھوٹا ضرور ہوں لیکن اتنا اپنے زور بازو پر یقین ہے مجھے کہ آپ کو اس تکلیف سے نجات ضرور دلا دوں گا۔“

اب امی کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ”کبھی بہن کا گھر بسنے کی بات نہ کرنا۔ کیا کرو گے تم؟ بندو قے لے کر سب کو گولیوں سے اڑا دو گے؟ اس طرح گھر نہیں بسا کرتے۔ بہت قربانیاں دی ہیں پڑتی ہیں عورت کو، تب جا کر وہ سسرال میں اپنا مقام بناتی ہے ورنہ

شوہر چلیا سے پکڑ کر نکال باہر کرتا ہے۔“

”اہو یہ تو میں کہنا بھولی ہی گیا۔“ منو نے ٹیک کے اوپر سے تمکین کو دیکھا۔ ”بھو کبھی بالے لیے نہ کرنا۔ نہ ہوگی پٹیا، نہ شوہر کے ہاتھ آئے گی۔“

تمکین کھلکا کر بس پڑی۔ امی کا پارہ اور بھی اوپر چڑھ گیا۔ انہوں نے پاس پڑی جوتی اٹھائی اور منو کو کھینچ ماری۔ وہ اس قسم کے حملے کے لیے پہلے ہی تیار تھا۔ اس نے بہت آرام سے جوتی کیج کر لی۔

”امی آپ تو آتے کے ساتھ آؤٹ ہو گئیں۔“ منو نے قہقہہ لگایا۔

”غضب نہ بتاتی ہوں تمہارے ابو کو۔“ پھر وہ تمکین کی طرف مڑیں۔ ”اس کی بیوی سر پر ناچے گی اس کے لکھو ابوجھ سے ابھی۔“

تمکین جس نے بہت مشکل سے اپنی ہنسی پر بند باندھے تھے ایک دم پھر سے ہنس دی۔

”ہاں ہاں اڈالو تم دونوں جی بھر کے مذاق۔“ امی غصے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”امی میں مذاق تو نہیں اڑا رہی، مجھے تو آپ کی بات سن کر ہنسی آگئی تھی۔“ تمکین نے جلدی سے صفائی چیش کی لیکن امی رکیں نہیں اور واک آؤٹ کر گئیں۔

”تم نے خواہ مخواہ امی کو ناراض کر دیا۔“ تمکین اس پر برس پڑی۔

”امی کیوں الٹی پٹیاں پڑھا رہی تھیں آپ کو۔“

”یہ میرا اور امی کا معاملہ ہے تم کون ہوتے ہو بیچ میں آنے والے۔“

”میں آپ کا بھائی ہوں۔ اگر امی نے آپ کو بحیرہ عرب میں پھینکنے کا تہیہ کیا ہوا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسے آپ کا اور امی کا معاملہ سمجھ کر چپ چاپ دیکھتا رہوں۔ بے وقوف ہی کسی لیکن ہیں تو آپ میری بہن۔“

تمکین ہنس پڑی۔ ”انخواب امی کو مناؤ۔ چلو جلدی کرو۔“

”یہ بھی تو مسئلہ ہے کہ امی کو ناراض نہیں دیکھ سکتا۔“ منو اٹھ کر امی کے کمرے کی

طرف چل دیا۔

تمکین کو معلوم تھا کہ اسے امی کو راضی کرنے میں ایک منٹ سے بھی کم وقت گئے گا اس لیے وہ مطمئن ہو گئی۔

شام کو امی ابو قریبی دوستوں اور رشتہ داروں کو دعوت نامے دینے جا رہے تھے تو تمکین کو اچانک خیال آیا۔

”امی آج تو برائیزل و عروسی جوڑا بھی ملنا تھا۔“

”جیسے یاد ہے برائیزل لے کر ہی دعوت نامے دینے جائیں گے۔ بعد میں دکان بند نہ ہو جائے۔“

ان کے جانے کے بعد تمکین نے ٹی وی کھول دیا۔ منو ساتھ والے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔

”ویسے کا جوڑا ابھی تک مل گیا ہوگا، تمکین نے سوچا۔“ لیکن ندانے اب تک فون نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے، اب تک ملائی نہ ہو لیکن اس صورت میں بھی وہ فون تو ضرور کرتی۔ اور پارلے ٹائم لینے کے متعلق بھی اس نے کچھ نہیں بتایا۔ میں خود فون کر نہیں سکتی۔ ویسے ندا کو دونوں صورتوں میں بتا دینا چاہیے تھا تا کہ اگر اس سے اریخ نہیں ہوا تو پھر میں اپنے پارلے سے بات کر کے ٹائم لے لیتی۔“

دوسرے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ تھوڑی دیر بعد منو نے اسے آواز دی۔

”بجوا آپ کا فون ہے۔“

”ندا کا ہوگا۔“ وہ جلدی سے اٹھی۔

”جی نہیں۔ آپ کے ان کا فون ہے۔“

”انہیں فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔“ تمکین بولی۔ پھر اسے خیال آیا کہ

اس جنون کے دورے اکثر اوقات زین کو پڑتے رہتے ہیں جب بیٹھے بٹھائے اچانک وہ ان کا نمبر ڈائل کرنے لگتا تھا یا ندا کو لے کر بہانے سے ان کے گھر آ جاتا تھا۔ ندا کے بقول

زین کو تمکینز یا ہو گیا تھا اور خطرناک حدوں کو چھو رہا تھا۔ یہ سوچ کر تمکین مسکرا دی۔ منو کمرے سے باہر لاؤنج میں جا چکا تھا۔ اس نے فون اٹھالیا۔

”ہیلو۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”ہیلو تمکین کیسی ہو؟“ زین کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

ہاں وہ زین ہی کی آواز تھی لیکن ہمیشہ والی گرم جوشی اور خوشی سے عاری۔ اس طرح تو عام سے دوست بھی بات نہیں کرتے۔ رسمنا ہی سہی تھوڑی بہت گرم جوشی کا مظاہرہ تو کرتے ہی ہیں لیکن زین کا لہجہ بالکل سیات تھا۔ جذبات کے رنگوں کے بغیر۔ پر تمکین نے اسے اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

”جی ٹھیک ہوں۔“ وہ بولی۔ ”لیکن آپ کو اس طرح فون نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ تو شکر ہے امی ابویس تھے اور فون منو نے ریسو کیا۔“

تمکین کا خیال تھا کہ اس کی بات کے جواب میں زین ہمیشہ کی طرح اپنی بے تابیوں، بے قرار یوں کی داستان سنائے لگے گا لیکن اس وقت اسے بہت حیرت ہوئی جب

زین بولا۔ ”فون کرنا بہت ضروری تھا۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

”باتیں کرنے کے لیے ہی تو آپ فون کرتے ہیں۔“ تمکین آہستہ سے ہنسی۔

”یہ باتیں فون پر نہیں ہو سکتیں۔“

”پھر؟“

”کہیں باہر مل سکتی ہو مجھے؟“

”جی؟“ تمکین تو حیرت سے لگ رہ گئی۔

”میں پوچھ رہا ہوں کہ مجھ سے کہیں باہر مل سکتی ہو؟“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ اپنے حواسوں میں آئی تو اس نے احتجاج کیا۔

”کسی بھی طرح، کسی بھی طریقے سے۔“

”دیکھیں، مجھے تو فون پر بات کرتے ہوئے اتنی گھبراہٹ ہوتی ہے۔“ اس نے

بہت معصومیت سے کہا۔ ”اور پھر شادی سے پہلے ہم بھلا یوں کیسے مل سکتے ہیں۔“

”یہ بہت ضروری ہے۔“

”بلیز آپ نجانے ہوں لیکن یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ نہ ای اجازت دیں گی اور نہ ہی

مجھے یوں ملنا چھانگے گا۔“

”بات تو ضروری ہے، پھر میں کرنی پڑے گی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ آرام سے بیٹھ کر تفصیل سے تم سے بات کروں۔ بہر حال اگر یہ ممکن نہیں ہے تو پھر مجبوری ہے۔“ زین نے گہری سانس لی۔ ”سوتھیں مجھے بہت افسوس ہے لیکن اس سلسلے میں میں مجبور ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ تمہارے ساتھ سخت زیادتی ہوگی لیکن بعض اوقات ہم جو کچھ سوچتے ہیں ویسا نہیں ہوتا بلکہ حالات خود ہمارے لیے راستے متعین کرتے ہیں۔“

”یہ آج آپ کسی باتیں کر رہے ہیں؟“ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی تمکین کا دل کانپ اٹھا۔ زین کے سنجیدہ لہجے سے اسے یقین ہو چلا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ اچھا نہیں ہوگا۔ اس نے اندیشوں کو اپنے ذہن سے کھرچ کر پھینک دینا چاہا لیکن وہ ویسے ہی اپنی جگہ قائم رہے۔

”آ۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کچھ باتیں انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں نہ صرف تمہیں چاہا ہے۔ تم سے محبت کی ہے اور کرتا رہوں گا۔ تمہارے لیے زندگی کی شاہراہ بہت وسیع بہت خوش نما ہے لیکن کوئی اور ہے جس کے لیے زندگی اپنا منہم کھوپتی ہے جس کا زندگی پر پورا حق ہے لیکن زندگی اسے یہ حق دینے پر تیار نہیں ہے۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے اسے زندگی سے ناکام توڑتے نہیں دیکھ سکتا۔ اگر میں نے اسے نہ بچایا تو انسان کا انسانیت پر اسے ایمان ہمیشہ کے لیے اٹھ جائے گا۔“ زین کہہ رہا تھا۔ ”اپنی تمام تر چاہت اور خواہش کے باوجود بھی شاید میں تمہیں کبھی کچھ نہ دے سکوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس تمہارے لیے کچھ اچھی خبر نہیں ہے۔“

”بلیز اتنا ہی کافی ہے۔“ تمکین کی آواز اندیشوں سے کانپ رہی تھی۔ ”مجھ میں کوئی بری خبر سننے کی ہمت نہیں ہے۔ بلیز زین کہہ دیں کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، وہ غلط ہے۔ مذاق ہے۔ آپ صرف مجھے ستارہ ہیں، تنگ کر رہے ہیں بلیز۔“ اس کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا لگ گیا۔

”سوری تمکین، میں تمہیں اتنی سی تسلی بھی نہیں دے سکتا کیونکہ اس میں ایک فیصد بھی جھوٹ نہیں ہے۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ بالکل سچ ہے۔“ زین کے لہجے میں جھوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ”میں یہ مٹکی توڑ رہا ہوں، اس لیے نہیں کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے بلکہ اس لیے۔“

تمکین میں مزید کچھ سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اب وہ بھی کیا گیا تھا کہنے کے لیے؟ سارے فیصلے تو زین نے خود کر لیے تھے۔ ریسپور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ سر پر گویا کوئی ہتھوڑے برس رہا تھا۔ ”رینجیکلیڈ، رینجیکلیڈ، رینجیکلیڈ۔“

”تمہیں۔“ وہ چیخ پڑی۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”مُو دوسرے کمر سے بھاگا ہوا آیا۔“

”جو کیا ہوا؟“ اس نے تمکین کو سہارا دیا۔ وہ مُو کے سینے سے لگ کر سسک اٹھی۔ ”تمہیں مُو ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ مُو نے نیچے گرا ہوا ریسپور اٹھا کر کان سے لگایا لیکن لائن کٹ چکی تھی۔ اس نے کریڈل پر رکھ دیا اور تمکین کو وہیں بستر پر بٹھا دیا۔

”جو ٹیک اٹ اپری۔“ وہ بولا۔ ”مخبر میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔“

وہ بھاگ کر اس کے لیے پانی لے آیا۔

”یہ لیں۔“ اس نے زبردستی گلاس تمکین کے لبوں سے لگایا۔

”اب بتائیں ہوا کیا ہے؟“ مُو اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سامنے قالین

فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس نے ریسپورڈ کر ڈیل پر فون دیا۔

”بجوا آپ بے فکر رہیں۔ آپ پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا میں۔“ اس نے تمکین کا سراپہ سینے سے لگایا۔

رات ساڑھے دس بجے کے قریب کار کا کارڈ ہارن سنائی دیا۔ ”امی، ابو آئے ہوں گے۔“ منو اٹھا۔

”انہیں آتے ہی یہ خبر مت سنا دینا۔ ابو ویسے بھی دل کے مریض ہیں۔ وہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔“ تمکین کی آنکھوں میں پھر ڈھیروں پانی اتر آیا۔

”اچھا۔“ منو گیسٹ کھولنے چل دیا۔

تمکین نے جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔

”تمکین۔“ دور سے امی کی آواز آئی۔ ”تمکین بیٹا۔ دیکھو کتنا اچھا لگ رہا ہے تمہارا عروسی جواں۔“

امی بہت خوش لگ رہی تھیں۔ بڑے سے دو فٹنی ڈبے ان کے ہاتھ میں تھے۔ وہ اتنی خوش اتنی بڑے جوش تھیں کہ انہوں نے تمکین کی سوچی ہوئی سرخ آنکھوں کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔

”چلو کمرے میں تمہیں دکھاؤں۔“ وہ اس کی کمر میں بازو ڈال کر اسے اس کے کمرے میں لے آئیں۔

”شہزادی گلگی میری بیٹی۔ بالکل شہزادی۔“

انہوں نے ایک ڈبہ کھول کر دوپٹہ نکالا اور اس کے سامنے لستر پر پھیلا دیا۔ پھر دوسرے ڈبے سے بھرے ہوئے کام والا لہنگا نکال کر اس کے گھٹنوں پر رکھ دیا تمکین کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ کر پھر رو دی۔

”نہ روتے نہیں ہیں۔“ امی نے اسے چکارا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ گھر چھوڑنے کے خیال نے تمکین کو اداس کر دیا ہے۔ ”بدشگونی ہوئی ہے یہ۔ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ خوشیوں

پر بیٹھ گیا۔

دکھ اور افسوس کی ایک اور لہر انہی اور آنسوؤں کی بھڑکی لگ گئی۔

”زین بھائی نے کچھ کہہ دیا ہے۔“

تمکین نے اپنے ہاتھ چھڑا کر چہرے کو ڈھانپ لیا۔ ہچکیاں لینے کی وجہ سے اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

”بجو کچھ تو کہیں، کچھ تو بولیں۔“ منو کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جب اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی تمکین نے کچھ نہ بتایا تو اس نے فون اٹھا کر زین کا نمبر ڈائل کیا۔ کتنی دیر تک گھنٹی بجتی رہی لیکن دوسری طرف سے کسی نے فون نہ اٹھایا تو مجبوراً اسے بھی فون رکھنا پڑا۔ وہ پھر تمکین کی طرف متوجہ ہوا۔

”بجو چلتیں بے شک نہ بتائیں کہ ہوا کیا ہے لیکن اتنا تو کہیں تو مت۔“ پلیز بجو۔“ اس نے آہستگی سے تمکین کے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ ”آپ تو میری ہر بات مانتی ہیں۔“

تمکین منہ کی ہمدردی پا کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ وہ دیر تک اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہا۔ یہ بات تو وہ کچھ چھڑا تھا کہ زین نے تمکین سے کچھ کہہ دیا ہے لیکن یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اصل میں بات اتنی چھوٹی نہیں تھی۔

”منو انہوں نے گھنٹی تو ڈونڈی ہے۔“ بالآخر اس نے ہچکیوں کے سچ بتایا۔

”کیا؟“ پہلے تو منو کو اپنی سامنتوں پر یقین ہی نہ آیا۔ ”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

لیکن یہ ہو چکا تھا۔ شادی سے صرف تیس دن قبل جب سب تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ دعوت نامے ہاتھ جارہے تھے۔

”بجو وہ لوگ یہ نہیں کر سکتے۔ اتنی آسانی سے وہ ہماری عزت سے نہیں بھیل سکتے۔

ہم نے کتنے لوگوں کو گواہ بنا کر یہ رشتہ طے کیا تھا کوئی گڈے گڑا یا کھیل نہیں رچایا تھا۔“ وہ ایک مرتبہ پھر فون کی طرف بڑھا۔ دوسری طرف مسلسل گھنٹی بج رہی تھی لیکن کوئی

کی دعا کرنی چاہیے۔ تم دونوں خوش رہو، ہمیں اس کے علاوہ کچھ نہیں کرنا چاہیے۔“
 تمکین نے بیگی پٹلیں اٹھا کر امی کی طرف دیکھا۔ وہ کتنی خوش تھیں۔ اسے یاد آیا کہ پہلے وہ ہر وقت اس کے لیے فکر مند رہا کرتی تھیں۔ ذات برادری کی ان کے نزدیک بہت اہمیت تھی اور اسی وجہ سے کئی بہت اچھے رشتوں سے انکار ہو چکا تھا۔ پھر زین کا رشتہ آیا تو گویا ان کی دلی مراد پوری ہو گئی۔ اور اب وہ ایک دم مصروف ہو گئی تھیں۔ کتنی خوشی سے مختلف کام نہنا رہی تھیں۔ وہ انہیں پھر دکھ دینے لگی تھی۔ کب تک چھپا سکتی تھی ان سے یہ بات۔ آخر کو تو اسے بتانا ہی تھا۔ مگر ابھی اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔

دکھ نے اسے بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ امی سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ سامنے پڑا سرخ جوڑا اٹھالیں اور کسی ایسی جگہ رکھ دیں جہاں تمکین کی اس پر نظر نہ پڑے اور وہ مزید کبھی نہ ہو لیکن ان کے اندر بہت نہیں تھی۔ اس کا سب کتنا ہی مل، تمام فلنے زندگی کی اس چھوٹی سی حقیقت کے سامنے سرنگوں ہو گئے تھے۔ وہ دوبار سے نیک لگاے چپ چاپ کھڑا تھا۔

”تم دونوں چپ کیوں ہو گئے۔“ امی نے کہا۔ ”ادھر آؤ مگر میرے پاس۔“ انہوں نے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ ”بہنوں کو ایک دن رخصت کرنا ہی پڑتا ہے۔ بچکے یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم اتنی سی بات پر اداس کیوں ہو گئے ہو۔“

”امی انہیں اندر رکھ دیں۔“ تمکین نے تمام تر بہت متوجہ کر کے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ان سے یہ بات چھپائی نہیں جاسکتی تھی۔ بہتر اسی میں تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو انہیں بتادیا جائے۔ ”فی الحال میں کہیں نہیں جا رہی۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو۔“ امی نے اسے گھورا۔ ”اس طرح کی بات نہیں کرتے۔ بد شکوئی ہوتی ہے۔“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ اس نے وہ پتہ تہہ کرنا شروع کیا۔ ”میں کہیں نہیں جا رہی۔ بھول جائیں وہ سب جو اب سے پہلے ہو چکا ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟“ امی نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا پھر وہ مٹو کی طرف

مڑیں۔ ”تم بتاؤ کیا بات ہے؟“

”امی جو ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ تمکین کی بات نے اس کے اندر بھی ہمت پیدا کر دی تھی۔ ”یہ رشتہ ختم ہو چکا ہے۔“

”کہتے ہو۔“ امی نے یقینی سے بولیں۔ ”اس قسم کا مذاق کرنے سے پہلے سوچ تو لیا ہوتا کہ۔“

”امی، یہ مذاق نہیں ہے۔“ مٹو نے ان کی بات کاٹی۔ ”مذاق تو وہ ہے جو ان لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔“

امی کچھ دیر تک بے یقینی سے ان کی جانب دیکھتی رہیں لیکن ان کے چہرے اسی طوفان کی کہانی سنار ہے تھے جو اچکا تھا۔

☆=====☆=====☆

”اتنی بچ اور گھٹیا حرکت کرنے سے پہلے تم نے یہ تو سوچا ہوتا کہ یہ صرف ایک لڑکی کا معاملہ نہیں ہے۔ تمکین اور اس کے پورے گھرانے کی عزت کا مسئلہ ہے۔“ زین کی امی اس پر برس رہی تھیں۔

”ہم نے انہیں زبان دے رکھی ہے۔ کس منہ سے جاؤں گی ان سے معذرت کرنے، کیسے بتاؤں کہ میرے بھوہار بیٹے نے ان کی بیٹی کو رو کر کے ایک طوائف کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”امی میں اپنی بات صحیح ثابت کرنے کے لیے کوئی معذرت نہیں کروں گا کیونکہ میں کچھ بھی غلط نہیں کر رہا۔ میں نے آپ کو ساری بات بتا دی ہے۔ اپنے لیے یہ راستہ میں نے خود نہیں چنا۔ حالات نے مجھے اس راہ پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا ہے اور اب میں اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔“

”ہاں آپ کیوں اپنے قدم پیچھے ہٹانے لگے۔“ ندا غصے سے چلائی۔ اسے زین کی اس حرکت سے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں نہجالی تھیں۔ ”وہ بہت

Justify نہیں کروں گا۔ مجھے تمہارے سامنے اپنی معافی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی کے سامنے معافی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں وہی کر رہا ہوں جو مجھے کرنا چاہیے۔ تمہیں کو ہاتھ تھانے والے کی مل جائیں گے لیکن لگاڑ کو کوئی نہیں ملے گا۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں، اسے تبدیل نہیں کر سکتا اور تمہیں خود کو اس معاملے میں ملوث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ زین نے کار کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

”مجھے ملوث کر چکے ہیں آپ۔“ ندا چلائی۔ ”مجھے اپنا آپ داؤ پر لگا کر بھی تمہیں کا گھر بسانا پڑا تو میں یہ بھی کر کر رہوں گی۔ آپ اپنی زبان سے پھر سکتے ہیں لیکن ہم نہیں۔“

☆=====☆=====☆

”سارا قصور تمہارا ہے۔“ امی کا اور کسی پر بس نہ چلا تو وہ منو پر برس پڑیں۔ ”تم ہی بد فائیں نکالتے تھے منہ سے۔ کتنی مرتبہ منع کیا تھا میں نے کہ یہ بد شگونی کی باتیں مت کرو لیکن بہت پڑھ لکھ گئے ہونا۔ ماں پاگل ہو گئی تھی تمہارے سامنے بھی ایک نہیں سنی تم نے میری۔ دیکھ لیا اس کا انجام۔ اس کا گھر بسا بھی نہیں تھا کہ اجڑ گیا۔“

منو دیوار سے ٹیک لگائے قالین پر بیٹھا جھکا کر مائی کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے غم سے اس کا دل پھٹ جائے گا۔

”شاید میری باتوں کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔“ اس نے سوچا۔ ”لیکن میں نے کبھی یہ سوچ کر تو کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں کیسے یہ چاہ سکتا تھا کہ بچہ کی آنکھوں میں آنسو آئیں۔“

ان کے خواب بچنا پھڑ رہے۔

”دیکھی ہے اپنے باپ کی حالت۔ اس عمر میں انسان اولاد کی خوشیاں دیکھنا چاہتا ہے اور انہیں غم دیکھنا پڑ رہا ہے۔ کس کس کو جا کر بتائیں گے کہ شادی سے صرف بیس دن قبل ہماری بیٹی کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ جب ہر انتظام مکمل ہو گیا تھا، دعوت نامے تک بانٹ دیئے گئے تھے۔“ امی رو پڑیں۔ ”یہ کیسی کاٹ لک لی ہے ان لوگوں نے ہمارے منہ پر۔ لوگوں کو تو باتیں کرنے کا موقع ملے گا۔ ہمدردی کے پردے میں وہ وہ باتیں سننا پڑیں گی

خوبصورت ہوگی، اتنی کہ اسے دیکھ کر آپ تمہیں کو کبھی بھول گئے کہ آپ کتنوں اس کی تصویر کوٹھا کرتے تھے۔ اب جب آپ کو اس سے زیادہ خوبصورت لڑکی نظر آگئی ہے تو آپ اپنی نگہیں کو بھول گئے۔ کل اس کی خاطر اپنی ماں اور بہنوں کو بھی بھول جائیں گے، اور آپ کے پاس اس کا بھی گھڑا گھڑا جواب ہو گا کہ آپ کے لیے یہ راستہ بھی حالات نے چنا ہے۔ جیسے آپ کی نگہیں گئی بھڑ میں ویسے ہی ماں اور بہنیں بھی جائیں بھڑ میں۔“

”میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں اس کی خوبصورتی سے متاثر نہیں ہوا۔“ وہ چڑہی گیا پھر سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”اگر کوئی تمہارے سامنے اپنی زندگی بار بار بھوسف اس عزت کی خاطر جو تمہیں تو حاصل ہے لیکن اس کے پاس اس کے حصول کا کوئی ذریعہ نہیں تو تم کیا کرو گے؟ بولو کیا فیصلہ ہو گا تمہارا؟“

”عزت تو مقدر کی بات ہے اور مقدر کو کون بدل سکتا ہے۔ آپ اسے لے بھی آئے تو وہ عزت حاصل نہیں کر سکی۔ وہ برا کرے گی تو سب ہی کہیں گے کہ سچی ماں کو بخنے والی اور اچھا کرے گی تب بھی یہی کہہ کر اس کی تعریف کی جائے گی کہ سچی تو طوائف لیکن شادی کے بعد کس قدر بدل گئی ہے۔ قدرت نے یہ لیبل اس کے اوپر چسپاں کر دیا ہے۔ بھائی آپ اس سے شادی کر کے بھی یہ لیبل اس پر سے نہیں ہٹا سکتے، اس کی پیشانی کا داغ نہیں دھو سکتے۔“ ندا بولی۔ ”اور آپ جانتے ہیں کہ آپ کی اس حرکت سے آپ کی بہنوں کے مستقبل پر کیا اثر پڑے گا؟“

”بہنیں اپنے گھر میں آرام سے رہیں گی۔ چاہیں تو ملے آجائیں، ان کے لیے اس گھر کے دروازے کھلے رہیں گے۔ نہ چاہیں تب بھی میں انہیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھوں گا۔“

”بھائی کبھی سوچا آپ نے کہ یہی کچھ جو آپ نے تمہیں کے ساتھ کیا اظہار نے میرے ساتھ کیا ہوتا تو کیا ہوتا؟ کیا کرتے آپ؟“

”چپ کر جاؤ۔“ زین نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔ ”میں کسی چیز کو، کسی بات کو

”کبھی میں سوچتا ہوں کہ شاید یہ اچھا ہی ہوا۔ اگر شادی کے بعد ایسا ہوتا تو بہت برا ہوتا۔ ہم میں سے کوئی بھی برداشت نہ کر سکتا۔ ہر کام میں قدرت کی مصلحت ہوتی ہے۔“

”منو، تمکین نے سراہا۔ ”تم تو ایسے نہیں سوچتے تھے۔“

”جیو، حالات انسان کی سوچ میں بہت تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔“ منو بولا۔ ”میں نے تو یہ بھی سوچا تھا کہ کہیں سے ہندو کے کرڈھروں گولیاں اس کے سینے میں اتار دوں جس نے آپ کو دکھ دیا ہے لیکن پھر مجھے یہ خیال بہت احمقانہ محسوس ہوا۔ اس سے آپ کی خوشیاں تو واپس نہ آسکتیں اور دکھ انہیں ملتا جو اس قصور میں حصے دار نہیں تھے یا پھر یہ سب غلط ہے۔ میں ہی بہت بزدل ہوں کہ ایسا نہیں کر سکا۔“

”نہیں منو، تم نے جو کیا ٹھیک کیا لیکن تمہاری ابھی کی سوچ ٹھیک نہیں ہے۔“ تمکین نے کہا۔ ”تم تو ہمیشہ مجھ سے یہی کہتے تھے کہ حق کسی کو یونہی نہیں مل جاتا چھیننا پڑتا ہے۔ تم کہتے تھے کہ مجھ میں حق حاصل کرنے کی صلاحیت ہے لیکن میں نے اپنے حقوق کا تعین نہیں کیا۔ لیکن منو اب میں نے اپنے حقوق کا تعین کر لیا ہے۔“

”آپ کیا کرتا چاہتی ہیں؟“

”میں اپنا حق چھیننا چاہتی ہوں۔ منگنی کا فیصلہ زین نے اکیلے نہیں کیا تھا۔ اسے توڑنے کا اختیار بھی اکیلے زین کے پاس نہیں ہے۔ اس نے اتنے لوگوں کی موجودگی میں مجھے اپنانے کا جو وعدہ کیا تھا وہ اسے ہر حال میں نبھانا ہوگا۔ میں اپنے حق سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔“

☆=====☆

”تم نے تو حد کر دی یار۔“ شعیب نے زین سے کہا۔ ”مانا وہ بے حد خوبصورت ہے لیکن خالی خوبصورتی میں کیا رکھا ہے۔ ہے تو اس محلے کی جہاں عزت ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔“

”میں اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اسے نہیں اپنا رہا۔“ زین جھلا گیا۔ ہر کسی نے

کہ کچھ چھلتی ہو جائے گا۔ کہاں سے دوسرا رشید ڈھونڈیں گے۔“

منو اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے امی کو چپ کرانے لگا۔ ابو کو جب سے پتا چلا تھا انہوں نے صرف ایک مرتبہ تمکین کو تسلی دی تھی اور اس کے بعد وہ بالکل گم صم ہو گئے تھے۔ نہ کھاتے پیتے تھے نہ کسی سے بولتے تھے۔ تمکین پوری کوشش کر رہی تھی کہ وہ کچھ کھانی لیں لیکن انہوں نے تو سب کچھ اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔

”امی آپ ہی ابو کو مانتا نہیں۔“ تمکین کمرے میں آئی۔ ”لیکن آپ ان کی دیکھ بھال کیا کریں گی۔ آپ کو تو خود دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔“ وہ ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”کیوں رورہی ہیں آپ؟ نہ آسمان ٹوٹا ہے نہ زمین شق ہوئی ہے۔ امی یہ زندگی کا اختتام تو نہیں ہے۔ آپ کو خدا پر بھروسہ نہیں ہے کیا؟ وہ تو گناہ گاروں کی بھی پردہ پوشی کرتا ہے۔ پھر ہم تو بے قصور ہیں کیا وہ ہماری مدد نہیں کرے گا؟“ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھایا۔ اپنے آنسو پونچھیں اور ابو کو دیکھیں۔ میں کھانا لگا کر آتی ہوں۔ پلیز انہیں کھانے پر راضی کریں۔“

”جیو آپ تو جانتی ہیں ناں کہ میں نے کبھی کسی بری نیت سے آپ سے وہ باتیں نہیں کی تھیں۔“ امی کے جانے کے بعد منو بولا۔

”تم کیوں امی کی باتوں کو دل سے لگاتے ہو۔ امی ابھی اس حد سے کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ انہیں کسی نہ کسی پر تو غصہ نکالنا ہے اور وہ یہ غصہ اسی پر نکالیں گی جو آسانی سے ہاتھ لگ جائے گا۔ تم اپنا دل برا مت کرو اور چپ چاپ ایک کان سے سن کر دوسرے سے آزادو۔“ تمکین نے اسے تسلی دی۔

”جیو میں نے اصل بات کا پتا کیا ہے۔“ منو نے کہا۔ ”وہ ذلیل شخص کسی طوائف کے پکر میں پڑ گیا ہے۔“

تمکین نے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر سر جھکا کر پاؤں کے ناخن سے قالین کھرچنے لگی۔

مسمری کو کبھی وہ اپنی اس خوشی میں شریک کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے کسی کو کچھ نہ بتایا۔ اماں اور بہنوں نے صبح کے وقت جب اسے خود سے بیٹھک میں داخل ہوتے دیکھا تو وہ سب ہی حیران رہ گئیں۔ کاہل اور پائل اسی وقت سوکر اٹھی تھیں۔ زرقا بارہونیم پر ریاض کر رہی تھی۔

”آؤ آؤ میری چنداں! اماں نے اسے تخت پر بٹھایا۔

”اماں بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانے کو مل جائے گا؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ کاہل بچن کی جانب لپکی۔ نگار کی بھوک اس دن کے بعد سے بالکل ہی اڑ چکی تھی۔ کتنے دن بعد اس نے ایسی کوئی فرمائش کی تھی۔ کاہل جلدی جلدی اس کے لیے ناشتا تیار کرنے لگی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ کہیں اپنا ارادہ بدل ہی نہ دے۔

”آج میری گڑیا بہت خوش دھمتی ہے۔“ زمرہ باکی نے پیار سے اس کی جانب دیکھا۔

وہ ہنس پڑی۔

”جی اماں، میں ہوں بہت خوش۔“

”شکر ہے تمہارے ہونٹوں پر ہنسی تو دیکھی میں نے۔“ پائل نے اس کے قریب آکر پیار سے اس کے بال بکھیر دیے۔ ”اب بالکل پیلے والی نگار بن جاؤ ویسی ہی بیماری سی ہنسنے والی۔“

نگار پھر ہنس پڑی اور زمرہ باکی کی گود میں سر رکھ کر وہیں تخت پر بیٹھ گئی۔

”اماں جب ہم خوش ہوتے ہیں تو لگتا ہے ہر چیز خوش ہے۔ ہمارا خوشی میں شریک ہے۔ فضول فضول باتوں پر بھی ہم خوش ہوتے ہیں۔ جتنے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”اور جب ہم اداس ہوتے ہیں تو کتنے تنہا رہ جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہر چیز اداس کی دھند میں لپٹی ہو جیسے کوئی ہمارا اپنا نہ ہو۔“

”چاہے تم اداس ہو گڑیا، چاہے خوش۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔“ زرقا بارہونیم چھوڑ کر اس کے پاس چلی آئی۔

اسے نگار کی خوبصورتی کا طعنہ دیا تھا۔ ”وہ عزت کی زندگی کی خاطر فریاد کر رہی تھی لیکن جب اس کی امید نہیں رہی تو وہ اس زندگی سے ہی چھٹکارا پانے کی تدبیر کرنے لگی۔ پھر کیا کرتا میں؟ اسے خودکشی کرتے ہوئے دیکھتا رہتا؟ میرا ضمیر کبھی معاف کر سکتا تھا مجھے کہ جانتے بوجھتے ہوئے میں نے ایک ایسی لڑکی کو بچانے کی کوشش نہیں کی جسے عزت مل سکتی ہے۔ معاشرے میں اونچا مقام مل سکتا ہے۔ کیا دنیا کی باتوں کے ڈر سے میں اسے وہاں چھوڑ آتا؟ میری بات سمجھنے کی کوئی بھی کوشش نہیں کر رہا۔“

”ساراقصود میرا ہے۔“ شعیب نے افسوس سے ہاتھ ملے۔ ”ہم نہ وہاں جاتے، نہ ایسا ہوتا۔“

”تم کیوں غلطی فعل کر رہے ہو؟“ کامران نے اسے سمجھایا۔

”میں نے ایسا نہیں چاہا تھا کہ زین کا دنیا ہو اگر اجڑ جائے۔ چنانچہ کیوں ہو گیا ایسے۔ میں اس کے لیے خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔“

”یار کیا ہو گیا ہے تجھے، وہ سب تو ایک مذاق تھا۔“ کامران نے اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ”وہاں جا کر تو میں بھی پاگل ہو گیا تھا۔ تمہیں ہی وہ پاگل کر دینے والی چیزیں، لیکن کسی کو دم بنا کر نہیں لایا میں۔ یہ زین کا ذاتی فعل ہے۔ اس میں تمہارا کیا قصور؟“

”تم کچھ بھی کہو کسی بھی دلیل لا دو لیکن اس سے حقیقت تو نہیں بدلے گی۔ میں نے زین کو چیلنج کیا تھا۔ وہ نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اس راد پر لگایا تھا۔“

”چپ کر یار۔“ زین مزید جھنجھلا گیا۔ ”میں تیری یہ بکواس سننے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا اور موضوع ختم ہو گئے ہیں کیا؟ اس وقت سے ایک ہی بات سن رہا ہوں۔ گھر میں، باہر، لگتا ہے کسی کو اور کوئی کام ہی نہیں ہے سوائے اس بات پر لعن طعن اور بحث مباحثہ کرنے کے۔“ وہ وہاں سے بھی نکل آیا۔

نگار بہت خوش تھی۔ آخر قدرت کو اس پر رحم آ ہی گیا تھا۔ وہ یہ خوشی کی خبر سب کو سنانا چاہتی تھی۔ اماں کو، کاہل کو، پائل اور زرقا کو، اپنے کمرے کی دیواروں کو، حتیٰ کہ میز، کرسی اور

”میں یہ بات یاد رکھوں گی۔“ نگار پھر ہنس دی۔

”کوئی تاہنا“ کا جمل نے اس کے سامنے ٹرے رکھی۔

”واہ واہ، پراٹھا، انڈہ اور چائے۔ دل خوش کر دیا۔“ وہ فوراً اٹھ بیٹھی۔

”کا جمل تمہیں کوئی کام تو نہیں ہے۔“ ناشتے کے بعد نگار نے پوچھا۔

”تم بتاؤ، تمہیں کیا کام ہے؟“

”ذرا میرے کمرے میں تو آنا۔“

”چلو۔“

وہ دونوں کمرے میں چلی آئیں تو نگار نے دروازہ بند کر دیا۔

”کا جمل تم تو جانتی ہو کہ میں یہ زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔“

”چندرا۔“ کا جمل نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”کیا حرج ہے اس میں آزادی

اور سکون سے رہ رہے ہیں۔ نشوونو کی ڈانٹ، نہ ساس کی پھٹکار اور نہ بچوں کی چیخ چیخ۔ اپنا

کمار رہے ہیں اور پیش کر رہے ہیں۔“

”کا جمل کاش میں تمہیں اپنا نقطہ نظر سمجھا سکتی لیکن شاید تم تب بھی نہیں سمجھو گی۔ تم

اس ماحول میں ریچ بس گئی ہو لیکن میں تمہارے علاوہ کسی سے کہہ بھی تو نہیں سکتی۔“ نگار

بولی۔ ”یہ تاہنا تم میری مدد کرو گی؟“

”کس مدد؟“

”پہلے تم بتاؤ، تم مدد کرو گی؟“

”تم بتاؤ تو تمہیں مجھ سے کس قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے اگر تمہیں کنویں

میں ڈبکی لگانے کے لیے میری مدد کی ضرورت ہوئی تو میں کیسے ہاں کہہ سکتی ہوں۔“

”اچھا پھر چھوڑو۔“ نگار کا سب جوش و خروش یکایک ختم ہو گیا۔ ”میں خود ہی کچھ کر

لوں گی۔“

اسے یوں ایک دم بجھتے دیکھ کر کا جمل نے بالآخر جھٹکا رڈال دیے۔ ”ہاں کروں گی

تمہاری مدد۔ اب بولو۔“

”میں یہاں سے نکلتا چاہتی ہوں۔“

”کس طرح نکلو گی یہاں سے۔“ کا جمل نے اسے پھر سمجھانا چاہا۔ ”نکتنی مرتبہ تمہیں

بتا چکی ہوں کہ اول تو کوئی یہاں سے جا ہی نہیں سکتا اور اگر کوئی صورت نکل بھی آئے تو وہ

زیادہ دیر یہاں نہیں ہوتی۔“

”کا جمل تم میری بات سنو تو۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”فرض کرو اگر کوئی دل سے مجھے

یہاں سے لے جانا چاہتا ہو تو؟“

”کون ہے وہ؟“ کا جمل نے بغور اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔

نگار سوچ میں پڑ گئی پھر دیر سے دیر سے اس نے اسے تمام واقعہ سچ سچ بتا دیا۔

”ہوں۔ تو تم خود کبھی کی حماقت بھی کر گزرنے والی تھیں اگر وہ لڑکا زین بروقت نہ

پہنچ جاتا۔“ کا جمل بولی۔ ”یہ وہی لڑکا ہے ناں، اسمارٹ سا، لمبا سا ہے۔ غالباً سیاہ پتلون

اور سوٹر پہنا ہوا تھا اس نے، شاید جینکٹ بھی تھی۔ وہی اس دن اٹھ کر صحن کی طرف نکلا

تھا۔“

”جی ویسی ہے۔“

کا جمل کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔ ”لیکن یہ مسئلہ اس قدر سیدھا نہیں ہے جتنا

تم سمجھ رہی ہو۔ وہ بھی اسی معاشرے کا فرد ہے جہاں ہمارے لیے کسی قسم کی گنجائش نہیں

ہے۔ ایک لمبے کو مان بھی لیا کہ وہ تمہارے ساتھ ٹھکس ہے لیکن سوچو، وہ سب سے کٹ کر

اور علیحدہ تو زندگی بسر نہیں کر باہوگا، اس کے مام باپ ہوں گے۔ بہن بھائی ہوں گے۔

دوست احباب، رشتہ دار ہوں گے۔ نہیں نگار ان میں سے کوئی بھی تمہیں وہاں جیسے نہیں

دے گا۔“

”کا جمل میں سب کا مقابلہ کروں گی۔ تمہیں معلوم نہیں ہے وہ بہت اچھا ہے۔ مجھے

سب سے بچا سکتا ہے۔ میں تو لمحوں میں اس کی اسیر ہو گئی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہے۔ یہ

کیا ہے۔ شاید اسی کو محبت کہتے ہوں مجھے نہیں پتا میں نے کبھی کی نہیں ناں لیکن یقین رکھو کاہل، وہ مجھے اپنی دنیا کی جھول جھولوں میں کھوئے نہیں دے گا۔ اس نے وعدہ کیا ہے مجھ سے۔ ”نگار نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”اور پھر اس زندگی پر میرا اتفاق تو ہے ناں کہ میں اسے عزت سے گزار سکوں۔“

”پتا نہیں تمہیں یہ عزت اور بے عزتی کا بخار کیوں لاحق ہو گیا۔“ کاہل نے ٹھک آ کر کہا۔ ”تم نے تو اپنا حق جتا ہے بوائے یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہارا بعد ہم سب کا کیا ہے گا۔ آج تک ہم نے تم سے کچھ بھی طلب نہیں کیا۔ الٹا تم نے جس چیز کی خواہش کی، کوئی فرمائش کی، اسے دوڑ دوڑ کر بھاگ بھاگ کر پورا کیا۔ اب جب ہمارا عروج ختم ہو رہا ہے جب ہمیں تمہاری ضرورت ہے تو تم ہمیں چھوڑ کر جانا چاہتی ہو۔“

”تو یہ کہو ناں کہ تمہیں میری نہیں اپنی ضروریات کی فکر ہے۔“ نگار تلخ ہو گئی۔ ”اس بات کی فکر ہے کہ تمہارا کیا ہے۔“

”یہ بہت بڑی حقیقت ہے میں انکار نہیں کروں گا اس سے۔“ کاہل بولی۔ ”تم بتاؤ کون سا رشتہ ضروریات کے تابع نہیں ہوتا؟ ہم تو ویسے ہی بدنام ہیں۔ اس معاشرے کی طرف دیکھو، جہاں جا کر عزت حاصل کرنے کی تم خواہش مند ہو۔ والدین اور اولاد سے بڑھ کر کون سا رشتہ ہوگا۔ لوگ اولاد کی خواہش کیوں کرتے ہیں؟ کیوں مانگتے ہیں بیٹا؟ اس لیے کہ وہ آخری عمر میں ان کے آرام و آسائش کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف جب تک بیٹے کی ضروریات والدین سے وابستہ رہتی ہیں، وہ ان کے ساتھ رہتا ہے۔ ان سے محبت بھی کرتا ہے۔ جب اس کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں تو وہ بیوی بچوں سمیت ماں باپ کو چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔ کون سا رشتہ ضروریات کا تابع نہیں ہوتا؟ جب تمہیں ہماری ضرورت تھی تو کیا تم نے یہ سب باتیں سوچی تھیں؟ تم نے یہ سوچا تھا کہ ہمارا رشتہ بھی ضروریات کا تابع ہے؟ اور نگار اس وقت تم جو رشتہ زین سے استوار کرنے جا رہی ہو کیا یہ تمہاری ضروریات کا تابع نہیں ہے؟“

”میں اس لیے تم سے الگ نہیں ہو رہی ہوں کہ مجھے تم لوگوں کی ضرورت نہیں رہی۔“ نگار نے دفاعی انداز اختیار کیا۔ ”میں تو اس لیے الگ ہو رہی ہوں کہ اس سے بڑھ کر ہٹک اور بے عزتی کوئی نہیں ہے۔“

”تم اچھی طرح سوچ لو نگار۔“ کاہل اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تم سے بہت سے لوگوں کا مستقبل وابستہ ہے۔ ان لوگوں کا مستقبل جن سے تمہارا ماضی وابستہ رہا ہے۔ پھر بھی تمہارا فیصلہ برقرار رہا تو میں تمہیں منع نہیں کروں گی۔ تم نے مجھ سے مدد مانگی ہے۔ جس حد تک میرے بس میں ہوں، میں تمہاری مدد کروں گی کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ مجھے پیار ہے تم سے۔ آج سے نہیں اس وقت سے جب میری ضروریات تم سے وابستہ نہیں تھیں۔“

نگار چپ چاپ کاہل کو کمرے سے باہر جاتا دیکھتی رہی۔ رات کو بیٹھک میں ہر روز کی طرح موچے کی خوشبو پھیل گئی۔ طبلے اور سارنگی کے سر بکھر گئے اور گھنگھر دوؤں کی جھنگار دو دیوار میں رپنے لگی۔ نگار اپنے کمرے میں بیٹھی کاہل سے ہونے والی گفتگو کے متعلق سوچ رہی تھی کہ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

”آجائے۔“ دو بولی۔

کاہل اور اس کے پیچھے زین کمرے میں داخل ہوئے۔ نگار کھل بچی۔ ایک لمحے میں اسے کاہل کی تمام باتیں جھول گئی تھیں۔

”آؤ۔“ وہ اچھل کر بستر سے نکلی۔ ”مجھے پتا نہیں تھا کہ تم نے آنا ہے۔“ اس نے جلدی سے اپنے لمبے بالوں کا ڈھیلا ڈھالا ساغور اٹھایا۔ ”پلیز بیٹھو ناں۔“

”شکریہ۔“ زین کمرے پر بیٹھ گیا۔ کاہل نگار کی آنکھوں سے پھوٹی مسرت کی کرنیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

”زین صاحب۔“ وہ میز سے ٹپک لگائے اس سے مخاطب ہوئی۔ ”نگار بے تو میری

سے ان کا دل نہیں جیت سکتی۔ وہ کھلے دل اور کھلے ذہن کی خاتون ہیں جلد ہی مان جائیں گی۔

”اور شادی کب تک کرنے کا ارادہ ہے؟ اب جب آپ فیصلہ کر چکے ہیں تو بہتر ہے، اس میں دیر نہ ہو۔“

”میں کوئی کورٹ میرج نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ نگار کو ویسے ہی رخصت کر کے لے کر جاؤں جیسا کہ اس کا حق ہے۔ اس میں مجھے کچھ وقت لگے گا لیکن اتنا زیادہ نہیں۔ میں خود بھی اس معاملے کو لگانا نہیں چاہتا۔ جتنا جلد ہو سکے اتنا ہی اچھا ہے۔“

کاہل نگار کی طرف مڑی جو چپ چاپ سر جھکا لے ان کی باتیں سن رہی تھی۔
 ”نگار خوب اچھی طرح سوچ لو تمہارے پاس زین صاحب کی زبان کے علاوہ اور کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ دونوں طرف کے حالات بھی تمہارے سامنے ہیں۔ اگر تم ہمت کر سکتی ہو تو آگے بڑھو۔ اگر نہیں کر سکتیں تو ابھی سے پیچھے ہٹ جاؤ۔ بعد میں شاید تم واپسی کا راستہ تلاش نہ کر سکو۔“

”میں فیصلہ کر چکی ہوں کاہل۔ اب میں کسی صورت پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔ زین کا کیا ہوا وعدہ ہی میرے لیے سب سے بڑی گارنٹی ہے۔“
 ”اب جب تم یہ فیصلہ کر چکی ہو تو مجھے اپنے ساتھ پاؤ گی۔“ کاہل کمرے سے نکل گئی۔

☆=====☆

”سنو آج سب کو اطلاع کر دینا کہ منگنی ٹوٹ گئی ہے۔ گھر میں کوئی فتنش نہیں ہے۔“ امی نے سپاٹ لیجے میں کہا۔ ”اور کراچی میں سیدہ اور ظفر کو بھی فون کر دینا۔“
 منو نے سوائیہ نگاہوں سے تمکین کی طرف دیکھا۔

”امی میرا خیال ہے کہ ابھی ایسا نہ کریں۔“ تمکین نے کہا۔
 ”پھر کب اطلاع کریں گے۔“ امی اس کی بات سے چڑ گئیں۔ ”جب سب رشتے

چھوٹی بہن لیکن مجھے اس سے ویسی ہی محبت ہے جتنی کسی ماں کو اپنی اولاد سے ہو سکتی ہے۔ یہ آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ میں پوری کوشش کروں گی کہ اسے کوئی نہ روکے۔“
 ”میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“ زین بولا۔

”اس میں شکر گزاری کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں وہ نگار کے لیے، اس کی خوشی کے لیے کر رہی ہوں اور میری خواہش ہے کہ یہ جہاں رہے خوش رہے۔“ کاہل بولی۔

”مہم یہ بھی آپ کو بتا دوں کہ یہ آج تک کسی محفل میں شریک نہیں ہوئی اور آپ کے معاشرے کی بہت سی نام نہاد شریف زادوں سے کہیں زیادہ شریف ہے لیکن شاید آپ تو یہ بات مان لیں لیکن آپ سے وابستہ افراد یہ بات ماننے سے انکار بھی کر سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ نگار کو اس کا جائز مقام دینے پر تیار ہو جائیں۔ پھر کہیں آپ چیونچ سے دستبردار تو نہیں ہو جائیں گے؟ مجھے آپ کے خصوص پر شک نہیں ہے لیکن ہو سکتا ہے آپ معاشرتی دباؤ نہ سہا سکیں۔ ایسی صورت میں نگار کا کیا بنے گا؟“

”میں نے یہ سب باتیں سوچ لی ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ بات میرے لیے ایک چیونچ بن گئی ہے اور یہ بھی غلط نہیں کہ مجھ پر معاشرتی دباؤ بھی ڈالا جا رہا ہے۔ نگار کو اپنا مقام بنانے کے لیے لگے دودھ تو کرنی پڑے گی، ہر عورت کو کرنی پڑتی ہے خواہ اس کا تعلق کہیں سے بھی ہو لیکن اس بات کا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اسے صرف اس کے بیک گراؤنڈ کی وجہ سے زد نہیں کیا جائے گا۔ تھوڑی سی محنت، تھوڑی سی کوشش اور تھوڑی سی قربانی دے کر یہ اپنا جائز مقام ضرور حاصل کر لے گی اور میں جانتا ہوں کہ اس میں اس کی صلاحیت ہے۔ یہ محنت بھی کرے گی، کوشش بھی اور قربانی بھی دے گی۔“

”آپ نے اپنے والدین کو بتایا ہے؟“

”میرے والد وفات پا چکے ہیں۔ والدہ حیات ہیں۔ میں ان سے بات کر چکا ہوں۔ انہیں میرے فیصلے سے صدمہ ہوا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ نگار اپنی خونیوں

دار اور دوست احباب آنا شروع ہو جائیں گے۔“

”ای امی آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔“

”تم پر تو اپنی ذات سے بڑھ کر بھروسہ ہے۔“ امی نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”تو امی! مجھے آپ سے کچھ اجازت لینی ہے۔“

”کابے کی اجازت؟“

”میں چاہتی ہوں کہ اپنا مقدمہ میں خود لڑوں۔ کیسے اتنی آسانی سے اپنے حق سے دستبردار ہو سکتی ہوں؟ امی پلیز ہم میں سے کسی نے ان سے بات نہیں کی۔ میں چاہتی ہوں کہ ان سے بات کروں۔ میں انہیں اس بندھن میں بندھنے کی اجازت نہیں دے سکتی جس پر میرا حق ہے۔ وہ میرا مقام میری جگہ ایک طوائف کو کیسے دے سکتے ہیں۔“
دفع کرو تمہیں۔ تمہارے لیے رشتوں کی کمی تو نہیں ہے، ہم نے اپنا حساب اوپر والے پر چھوڑ دیا ہے۔“

”امی، بکھریک کہہ رہی ہیں۔ اس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ انکار تو ہو ہی چکا ہے۔ پھر بات کر لینے میں کیا حرج ہے؟“ منو نے دے دے انداز میں تمکین کی تائید کی۔
”ایسا کبھی نہیں ہوا ہمارے گھرانے میں۔“ امی متذبذب تھیں۔

”وہ تو ایسا بھی کبھی نہیں ہوا جیسا میرے ساتھ ہوا ہے۔“ تمکین بولی۔ ”امی، میں کھلو ہا نہیں ہوں کہ جس کا دل آیا کھیل لیا جس کا دل چاہا پھینک دیا۔ میں جیتی جاتی لوکی ہوں۔ کیوں سب سمجھتے ہیں کہ ہم لڑکیاں بے حس ہوتی ہیں۔ جس کا جودل چاہے ہم سے سلوک کرے اور پھر ہم سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ ہم آف ٹیک نہ کریں یا اسے قسمت کا لکھا کچھ کر ممبر شکر کر لیں۔ میرے بھی کچھ احساسات ہیں۔ آپ لوگوں نے میرا رشتہ طے کیا میں نے چپ چاپ سر جھکا دیا لیکن زین کے رشتہ توڑنے پر میں یوں سر جھکا کر اس فیصلے کو تسلیم نہیں کر سکتی۔ امی میں اپنے گھرانے کی روایات کی زنجیریں نہیں توڑنا چاہتی تھی لیکن۔“ وہ بولتے بولتے ایک لمحے کے لیے رک گئی۔ ”آپ خود فیصلہ کر لیں۔ مجھے بچانا

چاہتی ہیں یا اپنے گھرانے کی روایات کو؟“

”روایات تو ٹوٹتی جیتی رہتی ہیں لیکن انسان اندر سے ٹوٹ جائیں تو کبھی نہیں جوتے۔“ ابو نے جانے کب وہاں چلے آئے تھے۔ ”انسان رو بوٹ نہیں ہوتے، نہ ہی انہیں ریویو کنٹرول سے اپنی مرضی کے تابع کیا جاسکتا ہے۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر تمکین کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”مجھے اچھا لگا کہ آج میری بیٹی نے اپنی تعلیم کا حق ادا کر دیا ہے۔ ہمیں آپ کی خوشیاں پیاری ہیں۔ ان روایات کا کیا فائدہ جو ہم سب کو ایک دوسرے سے دور کر دیں جو انسان اور تہذیب کو آگے بڑھانے کے بجائے ایک مخصوص وقت میں قید کر دیں۔ تمکین ہمیں اپنی روایتوں سے زیادہ آپ کے ہونٹوں پر آنے والی ہنسی عزیز ہے۔ اگر اس طرح آپ کے ہونٹوں پر ہنسی آ سکتی ہے تو روایت کے ان بندھنوں کو کاٹ دیں۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔“

☆=====☆=====☆

تھوڑی دیر قبل تمکین کا فون آیا تھا۔ وہ زین سے ملنا چاہتی تھی۔ زین کی امی نے کبلوا دیا تھا کہ وہ گھر پر ہی ہے۔

”شاید تمکین کو دیکھ کر، اس سے مل کر زین اپنا ارادہ بدل دے۔“ انہوں نے کہا۔
اب تک گھر کی ہر دیوار پر تمکین کی ہنستی مسکراتی تصویریں آویزاں تھیں۔ ندانے انہیں اتارنے سے امی کو منع کر دیا تھا۔ وہ تمام تر تفریاتی حربے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ تمکین کی زین سے ملاقات سے اس نے بہت سی توقعات وابستہ کی تھیں۔ اس کے ہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تمکین جیسی شرمیلی لڑکی یہ قدم اٹھا سکتی ہے۔ بہر حال اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر اس ملاقات سے بھی مطلوبہ نتیجہ برآمد نہ ہوا تو پھر وہ، وہ سب کچھ کر گزرے گی جس سے زین کے راہ راست پر آنے کی توقع کی جاسکتی ہو۔

بارن کی آواز سن کر ندانے پر وہ اٹھ کر باہر جھانکا۔ گیٹ پر تمکین کی کار کھڑی تھی جسے مؤذرا ریو کر رہا تھا۔ وہ بھاگ کر باہر نکلی۔ اسے دیکھ کر تمکین کا سر سے اتر آئی۔

”آئی کہاں ہیں؟“ تمکین نے پوچھا۔

”امی کچن میں ہیں۔“ ندائے بتایا۔ ”جج تو یہ ہے کہ وہ تمہارا سامنا نہیں کرنا چاہتیں۔ اس لیے انہوں نے خود کو ان کاموں میں الجھایا ہوا ہے۔“

”یار حد ہو گئی ہے۔ بھلا ان کا کیا قصور اس سارے قصے میں؟“ وہ بولی۔ ”کچن کہاں ہے؟“

ندائے کچن میں لے گئی۔

”آئی۔“ تمکین نے دروازے سے اندر جھانکا۔ ”آپ یہ کیا کر رہی ہیں۔ چھوڑیں۔ کھانا پکاتا رہے گا۔“ وہ اندر چلی آئی۔

”تمکین“ زین کی امی نے بہت مشکلوں سے آنسو ضبط کیے۔ ”بیٹا، میں نے پوری کوشش کر لی لیکن میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکی۔ پتا نہیں مجھ سے زین کی پرورش میں کہاں کوتاہی ہوئی۔“

”آئی! آپ کیوں شرمندہ ہوتی ہیں۔ میں کسی کو شرمندہ نہیں دیکھ سکتی۔ اور پھر آپ کا درجہ تو بہت بلند ہے میرے نزدیک۔“

”خدا ایسی بیٹیاں سب کو دے۔“ زین کی امی نے اسے گلے لگا لیا۔

”تمکین! تم نے سیدہ آپا اور ظفر بھائی کو اطلاع دی؟“

”نہیں، میں یہ کیسے کر سکتی تھی۔ میں نے امی کو منع کر دیا ہے کسی کو کچھ بتانے سے۔ میں نے اسما کو بھی کچھ نہیں بتایا حالانکہ اس کا ہر دوسرے روز فون آتا ہے پنڈی سے۔“

تمکین بولی۔ ”مجھے اپنی ہی نہیں تمہاری بھی فکر ہے۔ پتا نہیں وہ اس خبر کو کیسے لیں۔ کیا کر دیں۔ میں خود کو کنٹرول کر سکتی ہوں لیکن اور تو میرا بس نہیں چل سکتا۔“

”میری توراتوں کی نیندیں اور دن کا چین اڑا ہوا ہے کہ نہ جانے کب کراچی سے رشہ ٹوٹنے کی اطلاع آ جائے۔“ امی افسردگی سے بولیں۔

”اب دعا کریں امی کہ زین بھائی کو قتل آ جائے ورنہ انہیں بتانا تو بڑے گا۔“

”تمکین۔“ ندا کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ ”آئی ایم سوری تمکین۔ میں اور امی پوری کوشش کر چکے ہیں لیکن۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”کوئی بات نہیں یار ok This is not the end of life پھر تمکین منو کی جانب مڑی۔“ تم نہیں ٹھہرو۔“

”میںیں کار میں؟“

”ہاں۔“ وہ ندا کے ساتھ اندر چلی آئی۔

”تمکین! یہ سب کچھ تو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔“ ندا اس کے کندھے سے الگ ہو کر رو پڑی۔ ”شرمندگی کے مارے ہم نے کسی کو بتایا بھی نہیں کچھ۔ اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں شادی میں۔ چند دنوں میں سب رشتے دار پہنچ جائیں گے یہیں آ جائیں گی، تب کیا ہوگا؟“

”کیا ہوتا ہے؟“ تمکین ہولے سے ہنسی۔ ”شادی ہو گئی میری بھی تمہاری بھی۔“

ندائے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں۔“ تمکین بولی۔ ”میں بہت ڈر پوک، بہت بزدل سمجھتی تھی خود کو۔ میں نے اپنی ذات کو اسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی جو میرے خاندان کی روایات نے میرے لیے بنایا تھا لیکن شاید میں اندر سے اس قدر ڈر پوک اور بزدل نہیں ہوں یا پھر یہ سب منو کے ان لکچروں کا اثر ہے جو وہ وقتاً فوقتاً مجھے دیتا رہا ہے۔ یا ہو سکتا ہے کہ میں سب کے سامنے عزت سے سر اٹھا کر چلنے والے اپنے باپ کا سر جھکا نہیں دیکھ سکتی۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، آج میں وہ خول تو ذکر اپنا حق لینے آئی ہوں اپنے باپ کی عزت لینے آئی ہوں جو زین کے ہاتھ سے تار تار ہونے والی ہے۔ میں اتنی آسانی سے اپنا حق اس طوائف کے حوالے نہیں کر سکتی۔“

ندا اس کی جانب دیکھتی رہ گئی۔ اسے تمکین جیسی لڑکی سے اتنی جرأت کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا تمکد روئل جانے کے لیے۔ اسے تمکین کا پہلا روئل یاد تھا۔ فون کے دوسری جانب ہوتے ہوئے بھی وہ تمکین کے اس جذباتی صدمے سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے کیسے یہ خراسے سنائی تھی۔ یہ وہی جانتا تھا۔ تمکین اپنی کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ وہ اسے دکھ نہیں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کی محبت پر انسانی ہمدردی کے جذبات حاوی ہو گئے تھے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تمکین کو یہ دکھ دینا پڑا تھا۔

”صرف میں ہی بیٹھوں گی۔ آپ نہیں بیٹھیں گے کیا؟“

”مہمان نوازی کا تقاضا ہے کہ پہلے تم بیٹھو۔“ وہ بھی پلنگ کے ایک کونے پر نکل

گیا۔

”کیسی مہمان نوازی میں تو اس گھر میں مہمان نہیں ہوں۔“ تمکین نے خوش۔نی سے

کہا۔

”اس بات کا فیصلہ تمیزبان نے کرتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں مہمانوں کی

ٹیکاری میں رکھے گی۔“ وہ ذرا دیر کے لیے بھی اسے خوش فہمی میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

”تمیزبان دکھائی تو نہیں دے رہیں۔“ اس نے ارگرد دیکھا۔

”چند دن میں آنے والی ہے۔“

”تمیزبان کا نام جان سکتی ہوں؟“

”نہی۔“

”تو پھر ان دیواروں پر میری تصویریں کس لیے؟“

”امی نے انہیں اتارنے سے منع کیا ہے۔ لیکن بہر حال ایک آدھ دن میں اتارنا ہی

ہوں گی۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ مجھے انہیں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے، ابھی یہ محض امی کی ضد ہے۔“

تمکین آہستہ سے ہنس پڑی۔ ”تو آپ کو امی کا خیال ہے۔“

”میں یہ دعا نہیں کروں گی تو کون کرے گا۔“ امی بولیں۔

”چلو تمکین، بھائی اپنے کمرے میں ہیں۔“ وہ اسے زمین کے کمرے کے دروازے

پر چھوڑ گئی۔

نداکے جانے کے بعد تمکین نے دروازے پر دستک دی۔

”لیس۔“ اندر سے بیڑاری آواز آئی۔

تمکین نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

”آسکتی ہوں اندر؟“

جو توں سمیت صوفے پر لیٹا سرگیت پیتا ہوا زین تمکین کی آواز سن کر چونک اٹھا۔

”تمکین۔“ تم؟“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں اندر آسکتی ہوں؟“ اس نے ہرایا۔

”آؤ۔“ زین نے سرگیت الٹ کرے میں مسل دیا۔ وہ بے حد حیران تھا۔ اسے قطعاً

یہ توقع نہیں تھی کہ تمکین وہاں آسکتی ہے۔ اس وقت وہ اس سے ملنے کے لیے ذہنی طور پر تیار

بھی نہیں تھا لیکن اسے دروازے سے لوٹنا بھی ممکن نہیں تھا۔

”اچھا ہے، بات کلیئر ہو جائے گی۔ شاید جو بات اب تک کوئی اور نہیں سمجھ سکا وہ

تمکین سمجھ جائے۔“ اس نے سوچا۔

لیکن دوسری طرف وہ خود کو تمکین کی طرف سے ہر قسم کے روئل کے لیے بھی تیار کر

رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے اس پر الٹا اثر ہو میری بات کا۔ جذبات میں آکر نہ جانے کیا کر بیٹھے۔“

لیکن اب پتہ درا کا چارہ کھل چکا تھا۔ حالات خواہ کیسے بھی ہوں اسے ان کا سامان

کرتا تھا۔

تمکین دروازہ بند کر کے کمرے کے اندر چلی آئی۔

”بیٹھو۔“ اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ساتھ ہی وہ تمکین کے چہرے کا بغور

”اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ تم اس وقت یہاں کیوں آئی ہو؟“

”میں۔“ اس نے زین کے چہرے پر نظریں جمائیں۔ ”میں آپ سے اپنا حق لینے آئی ہوں۔ میں اپنے ابو کا جھکا ہوا سر اور تار تار ہوئی عزت نہیں دیکھ سکتی۔“

”تمہیں! میں نے سب کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے لیکن کوئی اسے سمجھنے پر تیار نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”لیکن مجھے امید ہے کہ تم اسے سمجھ لو گی۔ میں کسی کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کا قائل نہیں ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم مطمئن ہو جاؤ۔ تمہاری زندگی پر اس بات سے کوئی منفی اثر نہ پڑے۔“

اس نے ایک لمحے کے لیے تمکین کے چہرے کا جائزہ لیا جو بالکل بے سکون بیٹھی تھی۔

”نگار بہت دھبی لڑکی ہے بہت سادہ اور بہت بڑے غلطوں۔ وہ عزت کی زندگی گزارنا چاہتی ہے لیکن اس کے لیے سب راہیں بند ہیں۔ سوائے اس ایک راہ کے کہ اسے کوئی عزت دار شخص اپنائے۔ اس عزت کے حصول کی خاطر ایک دن وہ اپنی جان تک دے رہی تھی لیکن قدرت نے مجھے وہاں بھیج دیا۔ تمکین، اسے عزت کی زندگی نہ ملی تو وہ موت کو گلے لگا لے گی اور اب جب کہ میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں اور وہ اپنی سب کشتیاں جلا چکی ہے تو ہم میں سے کوئی بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ ایک بے قصور لڑکی صرف اس لیے موت کے منہ میں جانا چاہتی تھی کہ اس معاشرے میں اس کے پاس عزت کا سرٹیفکیٹ نہیں ہے، لیکن سوچو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟“

”آپ کا جذبہ ہمدردی قابل قدر ہے۔ مجھے اچھا لگا کہ آپ دوسروں کے غم کو محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ میرے غم کو بھی محسوس کر سکتے ہیں؟ اس کو دکھ محسوس کر سکتے ہیں جو آپ نے مجھے دیا ہے؟ یا اپنے دکھ اور غم سمیت آپ کے دل میں جگہ بنانے کے لیے مجھے بھی خودکشی کی ایک کوشش کرنی پڑے گی؟“ تمکین آہستگی سے بولی۔ ”زین اگر وہ بے قصور ہے تو قصور وار میں بھی تو نہیں ہوں۔ پھر مجھے کیوں سزا مل رہی ہے؟“

”تمہیں اور بہت سے اچھے لوگ مل سکتے ہیں۔ تم اتنی اچھی ہو تمہیں رشتوں کی کمی

نہیں ہو لیکن نگار کو کوئی نہیں ملے گا۔“

”آپ کو یاد ہے آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ بالکل میرے جیسی لڑکی کو جیون ساتھی بنانا چاہتے ہیں جس نے آپ کے علاوہ کسی کو اپنے تصور میں بھی جگہ نہ دی ہو۔“ تمکین بولی۔ ”اور اب جب میں نے آپ کو اپنے تصورات میں جگہ دے دی۔ آپ کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا تو آپ چاہتے ہیں کہ میں کسی اور کا ہاتھ تمام لوں اور جو خیانت میں نے آپ کے ساتھ نہیں کی وہ کسی اور کے ساتھ کر دوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے تصورات اور خواہوں پر آپ کا قبضہ ہو اور میں اپنا جسم کسی اور کے حوالے کر دوں میں یہ خیانت کیسے کر سکتی ہوں؟“

”تمکین! ابھی سے کوشش کرو۔ یہ سب جذباتی باتیں ہیں تم بڑھی لکھی لڑکی ہو۔“ زین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”نگار کی ذہنی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ کوئی اور صدمہ برداشت کر سکے۔ میں نے اس سے Commitment کی ہے۔ اب میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔“

”Commitment تو آپ نے مجھ سے بھی کی ہے اس سے تو شاید بند کرے میں کی ہو۔ مجھ سے سو (100) لوگوں کی موجودگی میں کی ہے۔ Word of Honour دیا ہے مجھے۔ دیکھ رہے ہیں یہ انگلی، یہ میں نے اب تک انگلی سے نہیں اتاری۔ اس لیے نہیں کہ اس میں سات چمکتے دسکے ہیرے لگے ہوئے ہیں جن کی مارکیٹ میں قیمت ہزاروں روپے ہے بلکہ اس لیے کہ محض انگلی نہیں آپ کا قول ہے۔ آپ کا وعدہ ہے جو آپ نے اتنے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں مجھ سے کیا تھا اور وعدے اصول ہوتے ہیں۔ ان کی قیمت سکد رائج الوقت کے ترازو میں نہیں تولی جا سکتی۔“ تمکین نے کہا۔ ”اور پھر آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ شادی سے صرف بیس دن قبل انکار کر کے آپ مجھے کوئی صدمہ نہیں پہنچا رہے۔ ہو سکتا ہے میری ذہنی حالت نگار کی ذہنی حالت سے بھی بری ہو لیکن میں اپنی نگلیوں اور دکھوں کا اشتہار نہیں لگانا چاہتی۔ مجھے کسی کے دم اور

ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنے حق کی ضرورت ہے جس سے میں دستبردار نہیں ہوں گی۔“

”اوکے۔ تم بتاؤ کہ تمہارے سامنے ایک شخص اپنی جان سے جا رہا ہو اور تم اسے بچا سکتی ہو لیکن اسے بچانے کے لیے تمہیں کچھ قربانی دینی پڑے تو تم کیا کرو گی؟ تمہیں! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اسے صرف ایک عزت دار زندگی کی خواہش ہے۔ ایک نام کی ضرورت ہے جو اس کی عزت کی ضمانت بن سکے۔“

”اور آپ اسے یہ عزت میرے باپ کی عزت داؤ پر لگا کر دلوانا چاہتے ہیں۔“
تمہیں نے اس کی بات کاٹی۔ ”میرے باپ کی تار تار عزت سے چادر بنا کر اس کا سر ڈھانپنا چاہتے ہیں۔ کیوں کر رہے ہیں آپ اتنی خود غرضی؟ اس کے لیے تو لفظ عزت محض ایک کتابی لفظ ہو گا جسے پانے کے لیے وہ اس قدر بے چین ہے، لیکن میرے لیے عزت ایک کتابی لفظ نہیں ہے۔ اُس کی تو پچھلی سات پشتوں میں سے بھی شاید ہی کسی کو لفظ عزت کے مفہوم سے واقفیت رہی ہو، لیکن میرا خاندان تو وہ ہے جس کی وجہ سے آج یہ سب لوگ عزت دار کہلاتے ہیں۔ جس نے دنیا کو عزت کا صحیح مفہوم دیا ہے۔ اسے عزت دیتے ہوئے آپ یہ بھول رہے ہیں کہ ہمیں بھی اپنی عزت عزیز ہے۔ میں آپ کی یہ تاویل نہیں مان سکتی۔ کل کو آپ کسی اور عورت کو تکلیف میں مبتلا دیکھیں گے تو ایک بار پھر آپ کا جذبہ ہمدردی بیدار ہو جائے گا۔ کتنوں کو اپنے گھر میں جکد دیں گے آپ؟ کتنوں کو عزت کے حصول میں مدد دیں گے آپ؟“

”تمہیں، مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں دکھ دیا ہے لیکن یقین کرو میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تمہاری سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں، مجھے کسی سے بھی انکار نہیں ہے لیکن یہ بھی تو سوچو کہ کسی کے عزت دار نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ عزت پر اس کا حق ہی نہیں ہے۔ نہ ہی عزت کسی کی اجارہ داری ہے۔ اپنے انتخاب سے کون پیدا ہوتا ہے۔ یہ تو چانس کی بات ہے۔ تمہاری باتیں بھی بہر حال غلط نہیں ہیں۔ میرے پاس ایک پروپوزل

ہے گو کہ میں نے یہ بھی کبھی نہیں سوچا تھا اور ایسا کرنا مجھے پسند بھی نہیں ہے، لیکن اس وقت بحالتِ مجبوری میں یہ تجویز پیش کر رہا ہوں۔“ زین بولا۔ ”میرے خیال میں اس تجویز سے لگا کر کو بھی اختلاف نہیں ہوگا۔“

”کیا تجویز ہے آپ کے پاس؟“
”میری سمجھ میں اس کا واحد حل یہی آیا ہے کہ میں تم سے اور نگار دونوں سے شادی کر لوں۔“

”اس تجویز سے نگار کو تو شاید انکار نہ ہو لیکن میں اسے کسی صورت قبول نہیں کر سکتی۔“
تمہیں نے اٹل لہجے میں کہا۔

”یہ نہ تو قانوناً منع ہے اور نہ شرعاً۔“
”ہم اپنے فائدے کے لیے شریعت کو استعمال کرنے سے بھی نہیں بچ سکتے۔“ تمہیں بولی۔ ”میرے لیے یہ ہنک ہے۔ میں اگر آپ کی خواہش پوری نہ کر سکوں، آپ کے آرام و آسائش کو نظر انداز کروں، اگر مجھ کو کوئی غامی ہو تو آپ دوسری شادی کر لیں لیکن اس کے علاوہ دوسری شادی کی کوئی صورت نہیں، میں اپنی یہ ہنک یہ تو جہنم برگرزداشت نہیں کر سکتی اور یہ بھی آپ کو بتا دوں کہ مجھے پارٹ ٹائم شو نہیں چاہیے۔ میرا شو ہر وقت، ہر لمحہ ہر روز پر صرف میرا شو ہونا چاہیے۔ مجھے ہر Alternate day شو ہر شہر کی ضرورت نہیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آپ نے مجھے مطمئن نہیں کیا۔ میں پھر کہہ رہی ہوں کہ میں اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوں گی اور نہ ہی آپ کو اپنے باپ کی تار تار عزت سے نگار کا سر ڈھانپنے کے لیے چادر بنانے کی اجازت دوں گی۔ آپ سوچ لیں کہ آپ نگار سے کیسے انکار کریں گے۔“

وہ زین کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆=====☆=====☆

”ظفر بھائی! اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے بہت مجبوری کے عالم میں

”ای، آپ تو سونے کے لیے کمرے میں گئی تھیں؟“

”یہ تم نے کیا کیا خدا، سب کچھ بتا دیا ظفر کو۔“ انہوں نے خدا کی بات نظر انداز کر دی۔ ان کی آواز میں اندیشہ ہی اندیشہ تھے۔

”ای، انہیں اس بات کا علم تو ہونا ہی تھا۔ پوچھنا اس کے کہ انہیں کسی اور ذریعے سے علم ہوتا اچھا ہوا کہ میں نے بتا دیا۔ صرف بتا دیا بلکہ میں نے ان سے مدد بھی مانگی ہے۔ وہ اس وقت سب سے مضبوط پارٹی ہیں۔ میں نے اپنا اور تکمیل دونوں کا گھر محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔“

”میں بالآخر زین کو سمجھا ہی لیتی۔ ظفر کو تو بھک بھی نہیں پڑنی چاہیے تھی۔ یہ تم نے کیا کیا خدا؟“

”ای۔ آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے درست کیا ہے۔ حالات کا تقاضا بھی تھا۔“ خدا نے کہا۔ ”زین بھائی کو سمجھ آتی ہوتی تو اب تک آپ بھی ہوتی۔ کم مغرباری کی ہے ہم نے۔ آپ نے سمجھا یا، میں نے سمجھا یا، تکمیل نے کوشش کی دوستوں نے ہر حربہ آزمایا۔ کس کی بات سمجھی انہوں نے؟ وہ محض باتوں سے قائل نہیں ہوں گے۔ انہیں دیے ہی ایک صدمے کی ضرورت ہے۔ جیسا انہوں نے تکمیل اور اس کے گھر والوں کو پہنچایا ہے۔“

☆=====☆

”زین، میں تو حیران ہوں تمہاری اس حرکت پر۔“ ظفر بھائی فون پر اس سے کہہ رہے تھے۔ ”یہ تم تو ایسے نہیں تھے۔ اول تو تم مجھے شریف انسان کو وہاں جانا ہی نہیں چاہیے تھا اور اگر چلے گئے تھے تو یہ دُم سا تھ لکانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”ظفر اس گھر میں جینا حرام ہو چکا ہے۔ میں سب سے وضاحتیں کر کر کے سمجھا سمجھا کر، عاجز آچکا ہوں۔ اب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہوں گا کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے اور اس میں ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔“

آپ کو فون کیا ہے۔ آپ زین بھائی کو سمجھائیں اور اگر وہ نہیں مانتے تو آخری حربے کے طور پر اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ انہیں بھی پتا چلنا چاہیے کہ جو صدمہ انہوں نے تکمیل کو پہنچایا ہے وہی ان کی بہن کو بھی پہنچ سکتا ہے۔ انہیں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ عزت دینا اتنا اہم نہیں جتنا عزت کو محفوظ رکھنا اہم ہے۔“ خدا کہہ رہی تھی۔ ”لیکن پلیز سمیعہ آپا کو نہ بتائیے گا پتا نہیں ان کا رد عمل کیا ہو خود ہی سارا معاملہ ہینڈل کیجیے گا اگر اس طرح بھی زین بھائی نہ مانے تو پھر آپ جیسا مرضی کریں۔“

”تم نے بہت اچھا کیا خدا جو مجھے سب کچھ بتا دیا۔ مجھے زین سے اس قسم کی بے وفائی کی توقع بالکل نہیں تھی۔ شکر ہے ابھی سمیعہ کو اس بات کی خبر نہیں ہے۔ ساتھ ہی مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم میں اتنی جرأت ہے۔ بہت بہادر ہوتے۔“

”ظفر بھائی، ہم لڑکیاں آپ مردوں پر انحصار کرتی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم میں جرأت نہیں ہے۔ ہم بہت جرأت مند ہوتی ہیں۔ صرف یہ Social Setup ہمیں بزدل بنادیتا ہے جو بونٹی کو پاؤں سے سسلے جانے کا خدشہ ہو تو وہ بھی کانٹے سے نہیں پوکتی۔ ہم تو پھر انسان ہیں۔ ایسے کیسے ہتھیار ڈال سکتے ہیں۔“

”مجھے بہت خوشی ہے خدا، کہ ہمارا انتخاب غلط نہیں تھا۔ زندگی میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو مضامین کا مقابلہ کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے گھر کو زمانے کے مرد و گرم سے محفوظ رکھ سکو گی۔“

”ٹینک یو۔“ وہ ہنس پڑی۔

”تم نے مجھ سے بات کر لی ہے اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ مجھے تکمیل اور تم دونوں ہی پیاری ہو اور میں تم دونوں میں سے کسی کا گھر برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ تم شادی کی تیاریاں جاری رکھو۔ ان شاء اللہ وقت مقررہ پر تم دونوں کی شادی ضرور ہوگی۔“

ندا ٹیلی فون رکھ کر مڑی تو اس کی نظری پر پڑی جو آؤی آؤی رنگت لیے اسے دیکھ

”اللہ خیر کرے۔ خیریت تو ہے؟“ اب تو ذرا ذرا سی بات پر امی کا دل ہول جاتا تھا۔

”بالکل خیریت ہے۔ بلکہ اب تو کبھی خیریت شروع ہوئی ہے۔“ وہ ہنسی۔
”تم جاؤ گی کیسے؟“

”زین بھائی کی کار پر ڈرامیڈ لے کر۔ اچھا ہے وہ کچھ دیر اپنے کمرے میں آرام کریں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ تمکین کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ ”سمجھو کہ ہمارا مسئلہ ہی حل ہو گیا۔“ وہ ہنس رہی تھی۔

”کیا کہہ رہی ہو؟“ تمکین نے اسے حیران نظروں سے دیکھا۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں جناب۔“ ندا مسکرائی۔

”انہونی باتیں مت کیا کرو۔ میں نے امی سے کہہ دیا ہے کہ وہ سب کو بتا دیں، دس دن بعد ہمارے گھر میں کوئی فنکشن نہیں ہے۔“

”اتنی جلدی ہمت ہار دی تم نے؟“

”ڈنڈے یا بندوق کے زور پر تو نہیں لاسکتی ناں زین کو۔ جس حد تک ممکن تھا میں نے کر لیا۔ اس سے زیادہ میرے بس میں کچھ تھا ہی نہیں۔“

”تمہارے بس میں بہت کچھ تھا تمکین لیکن تم نے آخر وقت تک شرافت سے کام لیا۔ اور کچھ نہیں تو تم سمیچہ آپا سے کہہ کر میری بات ختم کر اسکتی تھیں لیکن یہ تمہاری شرافت تھی کہ تم نے ایسا نہیں کیا۔“

”اس میں شرافت کی کیا بات ہے۔ کیا مل جاتا مجھے تمہارا گھر برادر کے۔ میرا دامن تو خالی ہے ہی میں تمہارا دامن کیوں خالی کروں۔“

”جو کچھ تم نہیں کر سکیں تمکین، وہ میں نے کر ڈالا۔“

”کیا؟“ وہ تقریباً چیخ پڑی۔ ”تم نے سمیچہ آپا کو بتا دیا؟“

”یہ فیصلہ تم اس قدر آسانی سے نہیں کر سکتے۔ مجھے تو تمہاری وضاحتیں سننی ہیں اور نہ میں تمہاری بات سمجھنا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ تم اب تک کیا وضاحت کرتے رہے ہو اور سب کو کیا سمجھانے کی کوشش کرتے رہے ہو۔“ ظفر بھائی کا لہجہ سخت تھا۔ ”میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمکین مجھے بہت پیاری ہے۔ بالکل چھوٹی بہنوں کی طرح ہے وہ میرے لیے۔ اگر تم نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اسے کوئی دکھ دیا تو پھر تم بھی محفوظ نہیں رہو گے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“

”یہ کہ تمکین کی شادی اسی دن ہوگی۔ تم سے نہ ہوئی تو مجبوراً اظہر سے کرنی پڑے گی۔“

”تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو۔“ زین غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ ”یہ جانتے ہو شادی میں کتنے دن رہ گئے ہیں۔ صرف دس دن، میں تمہیں بتا رہا ہوں ظفر تمہیں یہ بلیک میلنگ بہت مہنگی پڑے گی۔“

”تم چاہو تو اسے بلیک میلنگ کا نام دے دو لیکن میں اسے عزت کی حفاظت کا نام دیتا ہوں۔ تم لوگوں سے ابھی ہمارا کوئی رشتہ قائم نہیں ہوا جسے تو زانہ جاسکے لیکن سمیچہ میری بیوی ہے میرے بچوں کی ماں ہے۔ میں اسے یا اس کے گھر والوں کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ تم گھر سے باہر عزت بانٹنے پھر رہے ہو تو کیا مجھے گھر کے اندر اپنے خاندان کی عزت محفوظ رکھنے کا کوئی حق نہیں؟“

زین نے غصے سے ریڈیو بچ دیا اور سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

”ہوں۔“ ندا ہنسنے ہوئے کھڑکی سے دور ہٹ گئی۔ ”اسے کہتے ہیں سیر کو ملے سوا سیر۔ ذرا آپ بھی مزہ چکھیں اب۔“

وہ امی کے پاس آ گئی۔

”امی، میں تمکین کے پاس جا رہی ہوں۔“

کی گفتگو سن سکتی تھی، اس لیے میرا اندازہ ہے کہ ظفر بھائی نے وہی کچھ کیا ہے جو میرے اس زرخیز دماغ نے سوچا تھا۔" ندانے اپنے سر کی جانب اشارہ کیا۔ "بھائی صاحب کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔" اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "اب تو دادو کو کہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔"

"تم نے بہت غلط کیا ہے ندان،" جمکین نے اپنے ہونٹ کانے۔ "وہ یہی سمجھیں گے کہ ظفر بھائی نے ایسا میرے کہنے پر کیا ہے۔"

"تم ہو کس شمار قضا میں۔ یہ بڑوں کے معاملے ہیں۔ جنہیں بڑے حل کر رہے ہیں۔ تم بے فکر رہو، یوں بھی اس وقت زین بھائی کی قتل کے گھوڑے کہیں اور دوڑ رہے ہوں گے۔ تمہارا تو انیس خیال بھی نہیں آئے گا۔ پھر یہ بھی تو سوچو کہ آج کل میں ظفر بھائی کو معلوم ہو ہی جاتا تھا جس کا منطقی انجام بالآخر یہی ہونا تھا۔"

جمکین چپ چاپ بیٹھی قالین کے ڈیزائن پر انگلی پھیرتی رہی۔

"اور اب میں نے اس تابوت میں آخری کیل ٹھونکی ہے۔" ندابولی۔ "میں ہر وہ راستہ بند کر دیتا جانتی ہوں جو زین بھائی کو تمہارے علاوہ کسی اور کی طرف لے کر جائے۔"

"کیا کرو گی اب تم؟" جمکین نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔

"اسے چھوڑ دو تم اٹھو میرے ساتھ آؤ۔" ندانٹھ کھڑی ہوئی۔

"لیکن کہاں؟"

"مجھ پر بھروسہ ہے تبغیر سوال جواب کے میرے ساتھ آ جاؤ۔"

☆=====☆

"نگار تم اس قدر خود غرضی سے کام لو گی، یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔" زمر، بائی کبہ رہی تھیں، کبھی لوگ بیٹھک میں موجود تھے، نگار کی اس حرکت نے کبھی کو صدمہ پہنچایا تھا۔ صرف کا مل ہی تھی جو اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

"یہ تو سوچو کہ ان بہنوں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا۔ تمہارے منہ سے فرمائش

"میں نے ظفر بھائی کو بتا دیا۔"

"اوہ مائی گاڈ! کس نے کہا تھا تم سے یہ سب کرنے کو۔"

"کیا انیس خبر نہ ہوتی چھپ سکتی تھی یہ بات؟"

"چھپ سکتی تھی۔ بڑی بڑی باتیں چھپ جاتی ہیں۔ ہم کوئی بہانہ بنا سکتے تھے۔ تم نے بہت غلطی کی جو یہ حرکت کی۔ فائدہ اس کا کچھ نہیں ہوگا۔ ہاں نقصان سب کو اٹھانا پڑے گا۔"

"اب کرو مجھے Pat Pat ندانے ہنستے ہوئے کندھا آگے کیا۔

جمکین حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ "پلیز ندان میں تمہاری کوئی بات، کوئی حرکت سمجھ نہیں پاری۔"

"جمکین بی بی بات اتنی سی ہے کہ میں نے ظفر بھائی کو الف سے لے کر بے تک ساری بات بتانے کے بعد ایک پلان پیش کیا تھا۔" ندابولی۔ "میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ پہلے زین بھائی کو سمجھائیں اور اگر وہ نہ سمجھیں تو ان سے کہیں کہ وہ میرا اور اظہر کار شیہ توڑ رہے ہیں۔"

"یہ کہا تم نے؟" جمکین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہاں۔ اور یہ بھی کہا کہ وہ زین بھائی کو بتا دیں کہ تمہاری شادی طے شدہ دن ہی ہو گی، اگر زین بھائی کو تمہارا دلہنا بننا پسند نہیں ہے تو یہ خدمت اظہر سرا انجام دے گا۔"

"پاکل تو نہیں ہوئی تم؟"

"پاکل تو تم ہو، یہ محض ایک پلان تھا۔ کون سا جج میں اظہر کو تمہارے حوالے کر رہی ہوں۔" وہ ہنسی۔ "اور میں نے حفاظتی اقدامات کے طور پر ان سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ سمیو آ پا کو اس بات کی ذرا سی بھی خبر نہ ہو۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ آج ظفر بھائی نے فون کیا زین بھائی کو اور چونکہ میں صرف ایک جانب

نکلنے سے پہلے چیز تمہارے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اور تم انہیں کیا دے رہی ہو۔ مفلسی کا مذاق بھگتدی کا چہرہ۔“

”اماں! بھول جائیں کہ ہم نے اسے کبھی کچھ دیا ہے، جو کچھ دیا اسے ملا وہ اس کا حق تھا۔“ کا جمل ہوئی۔

”تو کیا تم لوگوں کا کوئی حق نہیں ہے اس پر؟ میری تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا کہ میری چار بیٹیاں ہیں۔ مانا کہ جو تمہارا فرض تھا وہ تم نے پورا کیا لیکن یہ اپنا فرض چھوڑ کر کیوں بھاگنا چاہتی ہے۔ کیا رکھا ہے اس زندگی میں؟ کچھ نہیں ملے گا تمہیں وہاں جا کر، سوائے اس طےنے کے کہ طوائف زادی ہے یہ۔ اس وقت یا تو تمہیں واپس نہیں آنا ہوگا، یا پھر سینی ٹوریز میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو گی۔“

”اماں! آپ اسے مت روکیں، وہ اچھا لڑکا ہے۔ اسے سنبھال لے گا۔“ کا جمل ہوئی۔ ”چلیز اماں۔ آپ نے میری کبھی کوئی بات نہیں مانی۔“

”اسے جانے بھی دوں میں اس لڑکے کے ساتھ، ٹھیک ہے چلی جائے، تم لوگوں کا کیا ہوگا؟“

”اللہ مالک ہے، وہ تو پتھر کے تیزے کو بھی رزق دیتا ہے، ہمارے لیے بھی کوئی نہ کوئی سہیل پیدا کر دے گا۔“ پھر وہ نگار سے مخاطب ہوئی۔ ”تم جاؤ اپنے کمرے میں جیسا تم چاہو، ویسا ہی ہوگا۔“

نگار اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اور جو میں نے چوہدری سلطان بخش سے وعدہ کیا ہے، اس کا کیا ہوگا؟“

نگار رک کر پُر امید نظروں سے کا جمل کو دیکھنے لگی۔

”وعدے توڑنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ اسے انکار کر دیں۔ آپ نہیں کریں گی تو میں کر دوں گی۔“

”یہ تمہاری شہ پر بے باک ہو رہی ہے۔“ زمر دبائی نے کا جمل پر اپنا غصہ نکالنا

چاہا۔

”اماں! ہم اسے کسی کام سے منع تو کر سکتے ہیں لیکن زبردستی کوئی کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے، پھر منع کرنے کا بھی کیا فائدہ۔“ نگار کمرے سے نکلنے لگی۔

”سنو نگارا!“ پائل نے اسے آواز دی۔ ”ہنسل اور گریٹل نے تو راستے کی نشانی کے طور پر روٹی کے ٹکڑے ڈالے تھے، تم جاتے ہوئے راستے میں گھٹکھڑو بکھیرتی جانا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں واپس آنا پڑے، اور تم واپسی کا راستہ بھول جاؤ۔“

اپنے کمرے میں آ کر نگار مسہری پر لیٹ گئی، اس کا سر درد سے چھٹا جا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی، لیکن بہت سی آوازیں اس کا تقاب کر رہی تھیں۔ مونا اور نازش کی ستائش تھی۔

”آپ یقیناً میڈکا ہوں گی، اور نہیں ہیں تو آپ کو میڈکا ہونا چاہیے۔ آپ تو اپنے زرت سے کسی بھی مہارشی کی ساری عمر کی تپا بھنگ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔“

سعد کا والہانہ پن تھا۔ ”بعض اوقات انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ کوئی جادو، کوئی سحر خود بخود اسے کسی رستے پر لے جاتا ہے۔“

”سوئڈش خوش تھی، جسے اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ طبع کیے ہوئے گہنوں ہی پر راضی ہو جاتا ہے۔“ یہ مونا کی آواز تھی۔

پھر بر طرف گھٹکھڑوؤں کی آواز پھیل گئی۔ مویسے کی خوشبو سے مہکی ہوئی گھٹکھڑوؤں اور طبلے کی آواز۔

”اماں پر بھی تو بھوت سوار ہے، اسے ہواؤں میں اڑانے کا، یہ نہیں دیکھیں کہ اتنی اڑان یہ بے گنجی سکتی ہے یا نہیں۔“ پائل کی آواز کے ساتھ ہی طبلے اور گھٹکھڑوؤں کی آواز تیز ہو گئی۔

انہی آوازوں کے پس منظر میں نجو کی سسکیاں ابھریں اور اس کا مختصر سا کمرہ ان سسکیوں کی آواز سے بھر گیا۔

جاتے ہوئے راستے میں گھٹکھر و گھٹکھری کی جانا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں واپس آنا پڑے اور تم واپسی کا راستہ بھول جاؤ۔“ پائل کھل رہی تھی۔

نگار اٹھ بیٹھی۔ اس نے وحشت زدہ کی نگاہوں سے ایک مرتبہ پھر کمرے کا جائزہ لیا، لیکن کوئی دیوار سانس نہیں لے رہی تھی، میز کرسی سکت تھیں، سنگھار میز کا آئینہ شفاف تھا۔ وہ مسہری سے اتر آئی۔ سنگھار میز کی دراز میں گھٹکھر وڈ کی جوڑی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے گھٹکھر و ہاتھ میں اٹھالے اور کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھی، سب سے نچلے خانے میں اخباروں کے بڈال کے پیچھے اس نے گھٹکھر و پھینک دیئے اور زوردار آواز کے ساتھ الماری کے پت بند کر دیئے۔

اس کا سر در سے پھٹا جا رہا تھا۔ سر در کی گولیاں نکال کر اس نے پانی کا گلاس اٹھایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون ہے؟“ اس نے انگلیوں سے کپنیاں داہیں۔

”کوئی ملنے آیا ہے تم سے۔“ یہ زرقا کی آواز تھی۔

”آ جاؤ، دروازہ کھلا ہے۔“

دروازہ کھلا اور بڑی بڑی چادروں میں لپٹی دولڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ نگار نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔

”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”آپ پہچان بھی نہیں سکتیں۔ میں ندا ہوں۔“ ان میں سے ایک بولی۔ ”اور یہ تمہیں۔“ پھر نگار کے چہرے پر اچانکیت کا تاثر دکھ کر کہنے لگی۔ ”میں زین کی بہن ہوں۔“

”آپ بہن ہیں زین کی۔“ وہ ایک دم کھل اٹھی۔ گلاس اور سر در کی گولیاں میز پر رکھ کر اس نے جلدی سے کرسی ندا کے سامنے کی۔

”پلیز آپ بیٹھیں یہاں اور آپ یہاں آ جائیں۔“ اس نے تمکین کو مسہری پر بیٹھنے کا

اشارہ کیا۔

”ہونہ، جیسوں کے لیے کھنے والی عورت۔“ یہ اس اکبری منڈی کے بیوپاری کی آواز تھی، جسے نگار نے دیکھا بھی نہیں تھا۔

”یہ قلعہ تو کوئی بھی فتح کر سکتا ہے، محض چند گھنٹوں کے عوض۔ بتاؤ کتنے سکوں کے عوض تم میرے پہلو میں آ سکتی ہو۔“

گھٹکھر وڈ کی آوازیں تھم گئیں، لیکن یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہر دیوار، ہر اینٹ سسک رہی ہو۔ نگار نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ سب کچھ اپنی جگہ ساکت تھا۔ دیواریں، مسہری، میز، کرسی، ہر چیز اپنی جگہ تھی، بالکل بے جان۔

اس نے ایک گہرا سانس لے کر آنکھیں دوبارہ موند لیں۔ ایک بار پھر آوازیں اس کا تعاقب کرنے لگیں۔

”میں رحمت کا فرشتہ تو نہیں ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد سن لی ہے۔“

”تم تو زین! رحمت کے فرشتے سے بھی کہیں بڑھ کر ہو میرے لیے۔“ نگار نے سوچا۔ ”دیوتا بنائے جانے کے قابل۔ میں تمہارے لیے سب کچھ قربان کر سکتی ہوں تمہارے لیے، کتنے مختلف ہو تم عام لوگوں سے۔“

”چھوڑ دو، چھوڑ دو،“ دیواریں جلائے لگیں۔ ”سب کچھ چھوڑ دو۔ سب خوبی، سب جذباتی رشتے، لیکن جو بیل تم چھوڑنا چاہتی ہو، وہ یہاں سے تمہارے ساتھ ہی جائے گا۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ چلائی۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا نہیں ہوگا۔“

”کچھ نہیں ملے گا تمہیں وہاں جا کر، سوائے اس طے کے کہ طوائف زادی ہے یہ۔“ اس وقت تمہیں یا تو یہیں واپس آنا ہوگا۔ یا پھر سینی فورم میں اڑیاں رنر رگز کر مری۔“

زمر دہائی کی آواز آئی۔

”میں رحمت کا فرشتہ تو نہیں ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد سن لی ہے۔“ زین کی آواز پھر ابھری۔

”ہنسل اور گریٹل نے تو راستے کی نشانی کے طور پر روٹی کے ککڑے ڈالے تھے، تم

”تمہیں پتا ہے، عزت کیا ہوتی ہے؟“ ندا کے لہجے میں طنز تھا۔ ”بی بی نگار! یہ یونہی مال روڈ اور لہرنی کی دکانوں پر نہیں ملتی، یہ کمائی ہوتی ہے صدیوں میں۔ یہ خاندانوں سے وابستہ ہوتی ہے ایک دن میں نہیں مل جاتی۔“

”آپ کو بھی بہت غلط فہمی ہے ندا۔ اس شہر میں کون کس قدر عزت دار ہے، یہ ہم سے زیادہ کون جانتا ہے۔“ نگار کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”ان میں سے کسی نے عزت مال روڈ یا لہرنی کی دکانوں سے نہیں خریدی، صدیوں میں کمائی ہے، لیکن شاید آپ کو یہ نہیں معلوم کہ یہ سب لوگ اتنی ہی صدیوں سے اپنی عزت ان چوباروں میں آکر لٹا رہے ہیں۔ شہر کے کسی رئیس کا نام لیں، میں آپ کو بتاتی ہوں، یہ سب کتنے صاحبِ وقت ہیں، کس کا بیٹا کیا کر رہا ہے، کس کی بیٹی کے کتنے بوائے فریڈ ہیں لیکن یہ سب اس لیے عزت دار ہیں کہ یہ اس محلے میں نہیں بستے۔ اس لیے کہ ان سب کے نام کے ساتھ ان کے باپ کا نام عزت کے سرِ عقیدت کے طور پر منسلک ہے اور ہم اس لیے بے عزت ہیں کہ ہم بغیر کسی منافقت کے وہ سب کچھ کرتے ہیں جو بے عزت دار لوگ چھپ کر کرتے ہیں۔“

ہماری جگہ اس لیے کی جاتی ہے کہ ہمارے نام صرف ہمارے ہیں۔ کاجل، پائل، زرقا اور نگار، ہم خود اس دنیا میں نہیں آئے تھے، لائے گئے تھے، میں اس لیے صرف نگار ہوں کہ کوئی شخص صدیوں سے کمائی ہوئی اپنی عزت میں سے مجھے کچھ نہیں دے گا۔ مجھے نہ محبت ملی، نہ عزت اور نہ وہ نام جس کی میں حق دار تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اپنی بے عزتی کا لبیل یہ ہیں چھوڑ دیا لیکن میں بے عزت نہیں ہوں۔ کونکہ یہ بے عزتی میں اپنے ساتھ نہیں لائی تھی، یہ سہیں اس دنیا سے مجھ سے نصی کی گئی ہے اور میں طوائف بھی نہیں ہوں۔ اس کمرے میں صرف ایک مرد آیا ہے اور وہ زین ہے۔“ نگار کی پھر بولی۔ ”اور وہ بھی کسی طوائف کے پاس نہیں آیا تھا۔ انسانیت کے نام پر ایک انسان کے پاس آیا تھا۔“

”تمہیں تمہارا حق نہیں مل سکا، مجھے افسوس ہے۔“ ندا بولی۔ ”اپنی ماں سے پوچھو کہ تمہیں یہ حق کس کے پاس سے ملے گا۔ کون تھا وہ جو تمہاری اس بے عزتی کا باعث بنا،

”بہت شکر یہ، ہم بیٹھے نہیں آئے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ یہاں آئی ہیں، اور یونہی کھڑے کھڑے چلی جائیں۔“

”میں نے کہا ناں کہ ہم بیٹھے نہیں آئے۔“ ندا بولی۔

”پھر؟“ نگار اس کے سر پہ لہجہ کو محسوس کر کے ایک دم بچھ گئی۔

”ہم تو یہ دیکھنے آئے ہیں کہ حسن اپنے اندر کس قدر کشش رکھتا ہے؟“

”میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔“ اس کے لہجے میں اس کے اندیشے کو بڑھاتے۔

”اس لیے کہ تم سمجھنا نہیں چاہتیں۔ واقعی تم بے حد حسین ہو۔ تمہیں تمہارے سامنے کچھ بھی نہیں لیکن محض حسین ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔“

نگار نے پہلے خالی خالی نظروں سے ندا کو دیکھا، پھر اس کی نگاہیں تمکین پر جم گئیں، جو چپ چاپ کھڑی نگار کو دیکھ رہی تھی۔

”بہت ناز ہو گا تمہیں اپنے حسن پر۔ کچھ غلط بھی نہیں۔ جس نے میرے بھائی سے اس کی مکیگیت کو چھین لیا اور خود اس کی جگہ بڑا جمان ہو گئی۔ وہ کوئی عام سی لڑکی ہو بھی نہیں سکتی۔“ ندا کے لہجے میں کاتھ تھی۔

”اس حسن نے کبھی کوئی فائدہ نہیں دیا مجھے۔ ہمیشہ میں نے اس کے ہاتھوں نقصان ہی اٹھایا ہے۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔ ”میں کیا ناز کروں گی اس پر۔“

”یہ بھی خوب رہی۔“ ندا استہزائیہ انداز سے بولی۔ ”پھر اسی کاٹ دار لہجے میں بولی۔“

”یہ دیکھ رہی ہو انگوٹھی؟ یہ میرے بھائی نے اپنے ہاتھوں سے سو گواہوں کی موجودگی میں تمکین کو پہنائی تھی۔ وعدہ کیا تھا اسے اپنانے کا، اس لیے نہیں پہنائی تھی کہ شادی سے صرف تیس روز قبل یہ رشتہ توڑ کر تم جیسی کسی طوائف کو گھر لے آئیں گے۔ میں ان پر بھی یہ بات واضح کر چکی ہوں، اور تم بھی سن لو کہ ہمارے گھر میں کسی طوائف کی جگہ نہیں ہے۔“

”چپ کر جائیں آپ۔“ نگار چیخ پڑی۔ ”بار بار یہ لفظ بول کر آپ میری بے عزتی کر رہی ہیں۔“

لیکن تمہارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ تم حق وصول نہیں کر رہیں۔ تم نے تو بھیک کے لیے سکنگول آگے کر دیا ہے، عزت اور بے عزتی کے نام پر بھیک طلب کر رہی ہو اور اسی بھیک کو تم نے اپنا حق سمجھ لیا ہے۔“

”میں سُنی سے بھیک نہیں مانگ رہی۔“ وہ چلائی۔ ”زین مجھ سے محبت کرتا ہے، مجھے چاہتا ہے، اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، مجھے سب سے بچانے کا وعدہ، حالات سے انسانوں سے اور زمانے کے سرد و گرم سے بچانے کا وعدہ۔“

”بہت بیوقوف ہو تم۔“ ندا بولے سے غصی۔ ”پناہ تو چیز یا گھر کے جانوروں کو بھی میسر ہے، حالات سے انسانوں سے اور زمانے کے سرد و گرم سے لیکن ان سے محبت کون کرتا ہے؟ ان سے محبت نہیں کی جاتی، بس ان کی حفاظت کی جاتی ہے، یہی حفاظت میوزیم میں رکھے قدیم زمانوں کے آثار کی جاتی ہے۔ تم نے غلطی سے اس پناہ اور حفاظت کو محبت سمجھ لیا ہے۔ کیا کبھی زین بھائی نے تم سے محبت کا اظہار کیا ہے؟ نہیں کیا ہوگا۔ اس لیے کہ انہوں نے صرف اور صرف تمہیں سے محبت کی ہے، ان کی بے تائیاں، ان کی چاہت، ان کی خواہش سب کچھ تمہیں کے لیے تھا اور ہے، اب وہ انسانیت کے نام پر مجبو رہیں۔ تمہیں پناہ دینے کے لیے، تمہاری حفاظت کے لیے، محض چند سکے ڈال رہے ہیں تمہارے سکنگول میں۔“

”بتاؤ کتنے سکوں کے عوض تم میرے پہلو میں آ سکتی ہو۔“ نگار کے کانوں میں سعد کی آواز گونجی۔

”مجھے سننے نہیں چاہئیں۔ نہ چاندی کے اور نہ انسانیت کے۔“ وہ چیخ پڑی۔ ”عزت کے نام پر بھی نہیں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

”تمہیں تو معلوم نہیں کیا درکار ہے اور کون تمہاری مراد پوری کرے گا۔ میں تو صرف تم سے اتنا کہتا چاہتی ہوں کہ تمہاری خواہشیں اور تمہاری حسرتیں اپنی جگہ۔ زندگی اور معاشرے سے تمہیں جو شکوے ہیں، ان کے سلسلے میں بھی ہم کوئی الزام اپنے سر نہیں لے

سکتے، کیونکہ ہم معاشرے کی ایک اکائی ہیں پورا معاشرہ نہیں۔ تم اپنی زندگی جیسے گزارنا چاہتی ہو گزارو۔ چاہے اپنی ماں اور بہنوں کے نقش قدم پر چلو، یا اپنے حق کی تلاش میں نکل کھڑی ہو۔ ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ مجھے واسطہ ہے اپنے بھائی سے، ان کا رشتہ سب سے ٹوٹ سکتا ہے لیکن اپنی ماں اور بہنوں سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ ہمارے ہاں سب ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ جس لڑکی کا بھی رشتہ استوار ہوا، وہ علیحدہ نہیں رہے گی، اس کا رشتہ ہم سے بھی قائم ہوگا اور میں یہ رشتہ تم سے قائم نہیں کر سکتی۔ تم اپنے لیے کوئی ایسا خاندان تلاش کرو۔ جو صرف تمہارے لیے ہو۔ کسی کو دکھ دے کہ تم کبھی اس کے خانے میں فٹ نہیں ہو سکو گی۔“

”پلیز، چپ کر جائیں۔“ اس نے ہونٹ کاٹ کر آنسو روکنے کی کوشش کی۔ چلی جائیں آپ یہاں سے۔“

”نگار! مجھے آپ سے ہمدردی ہے لیکن میں آپ کا مقدر تبدیل نہیں کر سکتی، کیونکہ اس کے لیے مجھے اپنے گھر اور اپنی محبت کی قربانی دینا پڑے گی اور میں اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکوں گی۔“ تمہیں بولی۔ ”پلیز مجھے معاف کر دیتا۔“

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہیں۔ اور مجھ سے پہلے زین کی زندگی میں داخل ہو چکی ہیں، آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میں اپنے گھر کی بنیادیں آپ کے خوابوں کی راہ پر نہیں بناؤں گی۔“ ضبط کی وجہ سے نگار کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

ان دونوں کے جانے کے بعد وہ سہری پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆=====☆

کدھر جا رہی ہے، کہاں جا رہی ہے؟
حیات اندھے ماشی کی انگلی پکڑ کر
کدھر لے چلی ہے، کہاں لے چلی ہے؟
غم دل کی زنجیر مجھ کو جکڑ کر!

زہریا لفظ ہے طوائف۔ وجود و اندر تک کاٹ دینے والا، ریزہ ریزہ کر دینے والا۔ عورت خواہ مخواہ ہی اعتبار کی حد بھلا کر بے اعتباری میں جا داخل ہوتی ہے۔ پھر وہ چاہے کچھ کرے سب سے بے نیاز ہو کر محبت اور وفا کی راہوں پر جتنا آگے بڑھ جائے، یہ ایک لیلیاں ات۔ انہیں اس کوٹھے پر دھکیل دیتا ہے، جہاں سے پیچھا چھڑا کر وہ آتی ہے۔“

وہ اٹھ کر کمرے کی کھڑکی سے باہر بھاگنے لگی۔ رات اپنے عروج پر تھی۔ گلی کے ہر کونے پر روشنی تھی، طلبہ اور پازیبوں کی مدھر آوازیں خشک رات کے اندھیرے میں کہیں تکمیل ہو رہی تھیں۔ موسیٰ کی خوشبو فضا میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، کسی نے دروازے پر دستک دی۔ نگار نے مڑ کر دروازے کو دیکھا جو آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ زمر دباؤ نے اندر آ کر ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا، جیسے کمرے کی بوچھل فضا سے نگار کی سوچوں کا اندازہ لگانا چاہتی ہوں۔

”کھڑکی بند کرو۔ اتنی ٹھنڈی ہوا میں کاہے کو کھڑی ہو۔“ پھر انہوں نے خود ہی آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی۔ ”رات بہت بیت گئی ہے۔ چلو جلدی سے سو جاؤ۔ انہوں نے زبردستی نگار کو سہری پر دھکیلا۔“

وہ بولے بس پڑی۔ ”اماں یہاں کی زندگی، اور روزی، روٹی اس رات سے تو وابستہ ہے۔ جتنی یہ بھیجے گی اتنا ہی جا دوڑھے گا۔ یہاں تو سونے کا یہی رونا ہے۔“

”کل چوہدری سلطان بخش نے آنے کا کہا ہے۔ انہیں کیا جواب دو۔“ زمر دباؤ نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔

”جیسا آپ چاہیں گی وہی بات ہوگا۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور مکمل منہ پر رکھ لیا۔

☆=====☆=====☆

موسیٰ کی مہک سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ماند پڑ گئی تھی۔ طلبہ اور سارا گلی کی سر فضا میں تحلیل ہو چکے تھے اور گنگھڑ و تھک کر خاموش ہو گئے تھے۔ نگار نے اٹھ کر کھڑکی کھولی، گلیاں اور چوہارے گہری دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ سورج دھند کی اس چادر کو کترنے کی

کسی انجمن میں بھی جانا عبث ہے
کوئی سی بھی محفل سنا عبث ہے
یہ وطنی ہوئی شب
یہ خوابوں میں کھویا ہوا آخری پیرس کا ہوا ہے؟
یہ بے رحم گلیاں، یہ بے مہر سڑکیں
یہ سویا ہوا شہر، کس کا ہوا ہے؟

صدا دے کے اس کو جگانا عبث ہے
کسی گھر، کسی در پہ جانا عبث ہے

یہ گہری اداسی ہے مدت سے پیاسی
مرے ذہن و دل کی، میرے جسم و جاں کی

اسے آنسوؤں سے بجھانا عبث ہے
ستارے زمیں پر اُلٹانا عبث ہے
کہیں کچھ ملے، کوئی دیوار ٹوٹنے
کوئی روشنی غم کے اس پار چھوٹنے
تو شاید یہ دل قید ظلمت سے چھوٹے

وگرنہ یہ سیرِ شبانہ عبث ہے!
یہ ہر کام یوں ڈگمگانا عبث ہے

نگار نے آنکھیں موند لیں۔ ”دل وحشی کا ماتم کب تک؟ ساعت گریز پاکی آرزو
سب تک؟ لا حاصل کی تلاش کب تک؟ وہ عورت نہیں ہے کیونکہ عورت تو پاکیزگی اور
نقدس کا دوسرا نام ہے۔ ہاں وہ عورت نہیں ہے۔ وہ تو صرف طوائف ہے طوائف۔ کتنا

کوشش کر رہا تھا، ہر طرف سناٹا کاراج تھا، وہ کھڑکی بند کر کے مسہری پر بیٹھ گئی۔

”سو، کتاب عمر کا ایک اور باب ختم ہوا، لیکن وہ جو عذاب ہے، درحقیقت اب شروع ہوا ہے۔“ اس نے سوچا۔ ”کتاب بے بس ہوتا ہے انسان۔ تدبیر بھی تقدیر سے لڑنے کے بالآخر تھک جاتی ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہا ہے کسی نے کہ۔“

مقدروں کی سید عبارت کے لفظ قاهر ہیں اور ہم سب

کسی کی نگاہی ہوئی کہانی میں اپنے کردار، حوصلے میں

اور میری زندگی کی کہانی ہتھکھڑوؤں کی جیمہ جیمہ سے شروع ہو کر اسی جھکنا پر ختم ہوتا

نہرہی ہے۔ عزت اور بے عزتی سب کے معیار برابر ایک سے لیے جدا ہیں۔“

وہ کسبل اوزھ کے لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں غیندے جوتھیں بورہی تھیں۔ تھوڑی ہی

دیر میں وہ نیند کی مہ بان دیوئی کی آغوش میں چل گئی۔

”ٹھک ٹھک ٹھک۔“ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون ہے؟“ اس نے شمار آواز سے پوچھا۔

”زین آیا ہے۔“ کاہل کی آواز آئی۔

نگار کی آنکھیں ایک دم کھل گئیں، لیکن دوسرے ہی لمحے کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

”بہت بیوقوف ہوں تم۔“ اس کے کانوں میں ندا کی آواز آئی۔ ”چناہ تو چڑیا گھر کے جانوروں کو بھی میسر ہے، حالات سے، انسانوں سے اور زمانے کے سرد گرم سے، لیکن ان سے محبت کون کرتا ہے؟ ان سے محبت نہیں کی جاتی، بس ان کی حفاظت کی جاتی ہے۔ یہی حفاظت میوزیم میں رکھے قدیم زمانوں کے آثار کی، جاتی ہے، تم نے غلطی سے اس چناہ اور حفاظت کو محبت سمجھ لیا ہے۔ کیا کبھی زین بھائی نے تم سے محبت کا اظہار کیا ہے؟ نہیں کیا ہوگا۔ اس لیے کہ انہوں نے صرف اور صرف تمہیں سے محبت کی ہے۔ ان کی بے تمایاں، ان کی چاہت، ان کی خواہش سب کچھ تمہیں کے لیے تھی اور ہے۔ اب وہ انسانیت کے نام

پر مجبور ہیں، تمہیں چناہ دینے کے لیے، تمہاری حفاظت کے لیے۔ محض چند سکے! ال رہے ہیں تمہارے سکول میں۔“

اس کے دل میں نیس سی ابھی۔

”بچھیں دو۔“ اس نے خود کو وقتی طور پر آنے والے لمحوں کے لیے تیار کیا۔

زین دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ وہ بھی بے خوابی کا شکار لگتا تھا، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، شیوہ برہمی ہوئی تھی۔

”آئیے بیٹھے۔“ نگار نے دل مضبوط کر کے کہا۔ وہ ابھی تک کسبل اوزھ سے مسہری پر بیٹھی ہوئی تھی۔

”ابھی تک سوئی ہوئی تھیں؟“ زین نے کرسی پر بیٹھنے ہوئے پوچھا۔

”ہاں رات کو دیر تک جاگنا پڑا۔“ وہ ہنسی۔

”نگار! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”حیرت ہے، بات تو مجھے بھی تم سے کرنی ہے۔“

”میری بات زیادہ ضروری ہے۔“ زین بولا۔

”اوہوں۔“ میری بات زیادہ ضروری ہے۔“ وہ بولی۔ زین کی سنجیدگی اور بات کرنے کا انداز اسے بتا رہا تھا کہ وہ کیا بات کرنے والا ہے۔

”اگر زین نے اب انکار کیا تو اس کی بہت سبکی ہوگی۔“ نگار نے سوچا۔ ”نہیں زین میں تمہاری سبکی برداشت نہیں کر سکتی۔ تم تو میرے بڑے ہوئے سکول میں انسانیت کے نام کے سکے ڈال رہے تھے لیکن مجھے یہ لینا گوارا نہیں۔ میں تمہیں تمہاری محبت نہ دے رہی ہوں، اس لیے نہیں کہ میں تمہیں تمہاری محبت کی ٹھیک دینا چاہتی ہوں، بلکہ اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تمہیں کسی کے سامنے جھوٹا ہونے نہیں دیکھ سکتی خواہ وہ تمہیں ہو یا میں۔ زین میں تمہارے ایک وعدے کی لاج رکھنے کے لیے اپنے آپ کو، اپنی ذات تک کو ختم کر سکتی ہوں۔“

”نگار بات یہ ہے کہ ہمارا مسئلہ کچھ۔“

”اس وقت ہمارے مسئلے کو چھوڑو، میرے مسئلے کی بات کرو۔“ نگار نے اس کی بات کاٹی۔ ”مجھے ایک چانس ملا ہے ایک فلم کی آفر ہوئی ہے۔“

”فلم کی آفر ہوئی ہے؟“ زین کے لہجے میں تعجب تھا۔

”ہاں وہ چوہدری سلطان بخش ہیں ناں، وہ فلمی ڈائریکٹر وہ ایک فلم کا سکرپٹ لائے تھے۔“ نگار نے کہا۔ ”کہہ رہے تھے کہ انہیں مجھے جیسی حسین اور کم عمر لڑکی چاہیے، اپنی فلم کے لیے۔“

”پھر؟“

”پھر یہ کہ سکرپٹ بہت اچھا تھا۔ رول بھی بہت ہاؤفل تھا میرے لیے، اس لیے میں نے ہاں بھر لی۔“ وہ مسکرائی۔ ”زندگی میں ایسا چانس کم ہی ملتا ہے، ایک دم اتنی بڑی کامیابی کا میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں نے سوچا شادی وادی تو ہوتی رہے گی۔ بہت عمر بڑی ہے، لیکن ایسا چانس پھر نہیں ملے گا۔ یہ ایک فلم بہت ہو گئی، جس کے بہت ہونے کے بہت چانسز ہیں تو کامیابی کے دروازے کھل جائیں گے۔ صرف پاکستان میں ہی ڈیمانڈ نہیں ہوگی، باہر بھی میری ڈیمانڈ ہوگی۔“ وہ ہر جوش لہجے میں کہہ رہی تھی۔

زین نے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”آئی ایم سوری زین! میں اس دن خواجہ خواہ ہی جذبات میں آگئی تھی۔ درحقیقت تو یہ ہے کہ مجھے خود مختار زندگی پسند ہے۔ میں شاید اتنے لمبے سفر میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں، خواجہ خواہ پاگل ہو گئی تھی میں۔ تم بھی میری وجہ سے پریشان رہے۔ آئی ایم سوری فارورٹ۔“

”اچھا ہوا نگار! کہ میں بہت آگے نہیں بڑھ گیا۔ تمہاری خاطر بہت کچھ واؤ پر لگا دیا تھا میں نے۔ اپنی عزت، نیک نامی، اپنی بہن کا مستقبل، اپنی اوپنٹین کی خوشیاں، لیکن شکر ہے کہ ابھی بازی میرے ہاتھ ہی میں تھی۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ”یہ بھی اچھا ہے کہ ابھی میں نے اپنی محبت، اپنی بے تائیاں تمہارے نام نہیں کی تھیں۔ مجھے امی کی اس بات پر یقین نہیں

آتا تھا کہ کچھ لوگ عزت کی زندگی گزارنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے لیکن اب یقین آ گیا ہے۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ ”میں تمہاری فلم ضرور دیکھوں گا، خدا حافظ۔“ اور وہ اس کی جانب دیکھنے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

نگار ایک تک دروازے کو دیکھتی رہی۔

”کچھ لوگ عزت کی زندگی گزارنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے۔“ اس کے کانوں میں زین کے فقرے گونجنے۔

”ہاں زین کچھ لوگ عزت کی زندگی گزارنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوتے۔ میرے لیے بھی تو زندگی نے ایک سانچہ بنا رکھا ہے جس میں ڈھلتا میرا مقدر ہے، افسوس تو اس بات کا ہے کہ میں تقدیر کے اس فیصلے سے لڑ نہیں سکتی تھی تو پھر تدبیر سے اسے بدلنے کی کوشش کیوں کرتی رہی، کیوں اہولہا ہوئی مجھے شعور کیوں عطا ہوا؟ کیوں میرے لیے۔“

آگئی جہل سے بدتر بھڑکی۔

جائے خواب کی تعمیر مقدر بھڑکی۔

زندگی میرے لیے کنہ ہے در بھڑکی۔

”تم نے کہا زین کہ اچھا ہوا تم بہت آگے نہیں بڑھ گئے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ میرے لیے اچھا ہوا کہ میں بہت آگے نہیں بڑھ گئی۔ ابھی میرے پاس واپسی کے لیے نشانی تھی۔ بعد میں شاید مجھے واپسی کا راستہ ہی بھول جاتا۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ الماری کے نچلے خانے میں اخبار کے بندلوں کے پیچھے سے اس نے گھنگھروں کی جوڑی نکالی اور ایک بار پھر گھنگھرو چھما چھم بجنے لگے۔

☆=====ختم شد=====☆